چکر کی موت
اشتیاق احمد

محمود ○ فاروق ○ فرزانہ

اور — انسپکٹر جمشید سیریز

ناول نمبر ۳۶۳

چکر کی موت

اشتیاق احمد

نام ناول ـــــ چکر کی موت

طابع ـــــ اشتیاق احمد

کتابت ـــــ سعید نامدار

سرورق ـــــ محمد مقصود عنید

قانونی مشیر ـــــ شمیم احمد ایڈووکیٹ

مطبع ـــــ افضل شریف پرنٹرز

قیمت ـــــ ۱۸ روپے

سالانہ قیمت ایک ناول ـــــ ۲۵۰ روپے

سالانہ قیمت دو ناول ـــــ ۴۵۰ روپے

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے، حضور نبیٔ کریم آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی جوتی کے دو تسمے تھے سامنے کے دوہرے۔

حدیث نمبر ۵۰۴، صفحہ نمبر ۱۴۷،
سُنن ابن ماجہ شریف، جلد سوم

(آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم چپل پہنتے تھے اور تسموں سے مُراد یہ ہے کہ ہر جوتی میں سامنے دو دو حلقے تھے چمڑے کے، ایک میں انگوٹھا اور بیچ کی اُنگلی ڈالتے اور دُوسرے میں باقی اُنگلیاں)

○

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے فرمایا، جب کوئی تم میں سے جُوتا پہنے تو پہلے داہنا جُوتا پہنے اور جب اُتارے تو پہلے بایاں اُتارے۔

حدیث نمبر ۵۰۶، صفحہ نمبر ۱۴۷،

سُنن ابنِ ماجہ شریف ، جلد سوم

○

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا، کوئی تم میں سے ایک جُوتا پہن کر نہ چلے، نہ ایک موزہ، بلکہ دونوں جُوتے یا موزے اُتار کر چلے یا دونوں کو پہن کر چلے۔

حدیث نمبر ۵۰۷، صفحہ نمبر ۱۴۷،
سُنن ابن ماجہ شریف، جلد سوم

○

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کھڑے ہو کر جُوتا پہننے سے منع کیا۔

حدیث نمبر ۵۰۹، صفحہ نمبر ۱۴۷،
سُنن ابن ماجہ شریف، جلد سوم

(انجاح میں ہے کہ مُراد وہ جُوتا ہے جس کے باندھنے کے تسمے لگانے کی ضرورت ہو، ایسا جُوتا بیٹھ کر پہنے، کیونکہ کھڑے کھڑے اس کو پہننے میں تکلیف ہوگی اور اس کا باندھنا دشوار ہوگا۔ ہمارے مُلک میں بوٹ ایسا ہی جُوتا ہے کہ اس کو بیٹھ کر پہننا اولیٰ ہے اور عام جُوتا کھڑے ہو کر بھی پہن سکتا ہے۔)

السلام علیکم!

کبھی کبھی میں عجیب مصیبت میں پھنس جاتا ہوں۔ ہوتا یہ ہے کہ پُورا ناول لکھ بیٹھتا ہوں، اس کے بعد باری آتی ہے، ناول کا نام رکھنے کی۔ ناول کا نام فاروق کے لیے تجویز کرنا بہت آسان ہوگا، لیکن میرے لیے یہ کام کافی مشکل ہے۔ خیر جیسے تیسے نام بھی تجویز ہو ہی جاتا ہے۔ اس کے بعد باری آتی ہے اس ناول کی دو باتیں لکھنے کی۔ یہاں آکر کئی بار میری گاڑی اٹک جاتی ہے، جیسا کہ آج اٹکی ہوئی ہے۔ کئی منٹ ضائع کر چکا ہوں یہ سوچتے ہوئے کہ اس ناول کی دو باتیں کیا لکھی جائیں، لیکن کوئی بات ذہن میں نہیں آ رہی۔ پہلے سوچا۔ ملک پر لکھ دیتا ہوں، پھر خیال آیا۔ ابھی پچھلے دنوں ناولوں کی دو باتیں صرف اور صرف مُلکی حالات پر ہی تو

ناول پڑھنے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ:

- یہ وقت نماز کا تو نہیں —
- آپ کو سکول کا کوئی کام تو نہیں کرنا —
- کل آپ کا کوئی ٹسٹ یا امتحان تو نہیں —
- آپ نے کسی کو وقت تو نہیں دے رکھا —
- آپ کے ذمے گھر والوں نے کوئی کام تو نہیں لگا رکھا۔

اگر ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ہو تو ناول الماری میں رکھ دیں۔ پہلے نماز اور دوسرے کاموں سے فارغ ہو لیں، پھر ناول پڑھیں۔ شکریہ!

مخلص:

اشتیاق احمد

تیسواں کیپسول

"ڈاکٹر! اس شیشی میں کتنے کیپسول ہیں؟" ایک کمرے میں ایک آواز اُبھری۔

"ج — جی انتیس" گھبرائی ہوئی آواز میں کہا گیا۔

"جی انتیس یا صرف انتیس؟"

"جی ہاں — صرف انتیس"

"شکریہ! پہلے کتنے تھے؟"

"جی — پہلے اس میں تیس تھے — یہ شیشی تیس کی ہی ہوتی ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"بہت خوب! یہ دیکھو — تیسواں کیپسول میں نے اس میں سے نکال لیا ہے اور اب اپنے پاس سے اس میں بالکل اسی رنگ کا اور اسی سائز کا ایک کیپسول شامل کر رہا ہوں — یہ دیکھو ڈاکٹر — میں نے کیپسول اس میں ڈال کر ڈھکنا لگا دیا ہے اور شیشی کو خوب ہلا رہا ہوں — اب کیا تم بتا سکتے ہو —

"تیسواں کیپسول کون سا ہے؟"

"ج۔ جی۔ نہیں۔ میں کیسے بتا سکتا ہوں س۔ سر۔"

"میں بھی نہیں بتا سکتا، میں تو صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ تیسواں کیپسول اس زہر کا ہے۔ جو میں نے تم سے منگوایا تھا۔ میں نے زہر کے اس سفوف کو ایک خالی کیپسول میں بھر دیا تھا اور اب وہ اس شیشی میں موجود کیپسولوں میں شامل ہو چکا ہے۔"

"ک۔ کیا۔" ڈاکٹر اور بھی گھبرا گیا۔

اس شیشی کو اپنے پاس، اپنے کلینک میں محفوظ رکھ لو۔ حاتم غوری دل کا مریض تم سے علاج کروا رہا ہے نا؟"

"جی ہاں! بالکل کروا رہے ہیں۔"

"تم یہ شیشی اسے دے دو گے۔ وہ یہ کیپسول ایک روز کھاتا ہے۔ تم نے یہی کیپسول اسے تجویز کیے ہوئے ہیں۔ میرا مطلب ہے، دوسری دواؤں کے ساتھ۔"

"اُف مالک۔ اس۔ اس طرح تو۔ تو وہ۔ مر جائیں گے س۔ سر۔"

"ہاں ڈاکٹر صاحب۔ یہی تو میں چاہتا ہوں۔ کہ اب وہ مر ہی جائے۔ بہت دن جی لیا۔ اب میں اسے اور زندہ نہیں دیکھ سکتا۔ لہٰذا زیادہ سے زیادہ اب وہ تیس دن

اور کم از کم ایک دن اور زندہ رہے گا۔ یا اس کیپسول کی باری کل ہی آ جائے گی۔ یا پھر تیس دن کے اندر اندر کسی بھی دن آ جائے گی۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔"

"لل۔ لیکن۔ اس طرح تو میں مجرم بن جاؤں گا سر۔ قتل کا مجرم۔"

"پہلے تم نے کیا نہیں کیا، جو اب ڈر رہے ہو۔ تمہاری زندگی میرے نزدیک ایک کھلی کتاب کی طرح ہے۔ تم نے جو کالے دھندے کیے ہیں۔ ان سب کی مجھے اطلاع ہے۔ اگر یقین نہیں تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔ میں نے تمہاری بھی باقاعدہ ایک فائل تیار کرا رکھی ہے۔ اگر میں یہ فائل پولیس کے حوالے کر دوں تو تم پھانسی سے کم تو کیا سزا پاؤ گے اور پھانسی کی سزا سے بہتر ہے، آدمی زہر کا کیپسول منہ میں رکھ لے۔ اگر تم یہ شیشی حاتم غوری کو نہیں دینا چاہتے تو پھر یہ تمام کیپسول اپنے منہ میں الٹ لو۔ تمہارے لیے دو ہی راستے ہیں۔ کیا سمجھے؟"

"زہر کا یہ کیپسول اگر میں نے حاتم غوری صاحب کو کھلا دیا تو بھی پولیس مجھے گرفتار کر لے گی۔"

"نہیں! اس صورت میں معاملہ شک میں رہے گا۔ تم کہہ سکو گے کہ تم نے تو سیل لگی شیشی حاتم غوری کو دی تھی۔"

"بہرحال مجھ پر شک تو کیا جائے گا۔"

"کوئی پروا نہ کرو۔ اگر میں فائل پولیس کو دے دوں گا تو پولیس کو تمہارے بارے میں کوئی شک بھی نہیں رہ جائے گا۔ بلکہ یقین ہو جائے گا کہ تم کیا ہو۔ کیا تم اپنی فائل نہیں دیکھو گے۔"

"نن۔ نہیں۔ میں یہ شیشی لے جا رہا ہوں۔ ابھی میں نے اپنا فیصلہ نہیں سنایا۔ گھر جا کر غور کروں گا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔"

"تم بے وقوف ہو۔ اس میں فیصلہ کرنے کے بارے میں سوچنے کی کیا ضرورت ہے۔ جہاں اتنے جرم کیے ہیں وہاں ایک اور سہی۔"

"اس سے پہلے مَیں نے قتل جیسا بھیانک جرم نہیں کیا۔"

"جھوٹ۔ بالکل جھوٹ۔ تمہارے جرم تو بہت گھناؤنے ہیں۔ جعلی دواؤں کا کاروبار کرنا۔ کیا انسانوں کو قتل کرنا نہیں ہے؟"

"ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔ لیکن میں جعلی دواؤں کا کاروبار نہیں کرتا۔"

"کیوں۔ کیا تم اپنے کلینک پر نمبر دو دوائیں نہیں رکھتے نمبر ایک بھی رکھتے ہو اور نمبر دو بھی۔ زیادہ منافعے کے لیے۔ کیا یہ مریضوں کی زندگیوں سے کھیلنا نہیں ہے؟"

ڈاکٹر کے منہ سے کوئی جواب نہ نکل سکا۔ آخر وہی آواز پھر ابھری:

"جاؤ ڈاکٹر۔ گھر جا کر صرف یہ غور کرو کہ میں بڑا مجرم ہوں یا تم۔"

ڈاکٹر نے شیشی اٹھالی اور کمرے سے نکل گیا۔

"ڈنگو۔ تم اس کی نگرانی کرو گے۔ اگر یہ پولیس کی طرف جاتا نظر آئے تو ختم کر دینا اسے۔" سخت لہجے میں کہا گیا۔

"او کے باس۔ آپ فکر نہ کریں۔ لیکن باس۔ آخر اتنا لمبا چوڑا جھنجٹ پالنے کی کیا ضرورت۔ آپ مجھے کیوں حکم نہیں دیتے۔ حاتم غوری صبح کا سورج نہیں دیکھ سکے گا۔ ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر دوں گا۔"

"بکواس نہ کرو ڈنگو۔ ہر کام کا ایک سلیقہ ہوتا ہے۔ اگر ہر کام کو اس کے سلیقے کے مطابق نہ کیا جائے تو مزا نہیں آتا۔ تم ہو عقل سے پیدل۔ جب کہ میں ہر کام عقل سے کرنے کا عادی ہوں۔"

"میں جا رہا ہوں باس۔ سائے کی طرح اس کے ساتھ لگا رہوں گا، لیکن اگر اس نے شیشی حاتم غوری کو نہ دی تو مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"اس صورت میں اسے اپنے خنجر کی ایک جھلک دکھا دینا اور بتا دینا کہ موت کا فرشتہ تو اس طرح بھی تمھیں نہیں چھوڑے گا۔"

"اچھی بات ہے باس۔ میں جا رہا ہوں۔"

باس کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔

"یہ آج تم پر کہانی کا بھوت کیوں سوار ہو گیا ہے؟" محمود نے جھلا کر کہا۔

"کک۔ کیا کہا۔ کہانی کا بھوت۔ بھئی واہ! یہ تو کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے۔"

"دھت تیرے کی۔ ایک پر کہانی کا اور دوسرے پر ناولوں کا بھوت سوار ہے۔" محمود نے جھلا کر ران پر ہاتھ مارا۔

"اب تمھارے لیے ایک ہی راستا ہے۔ یہ کہ تم بھی اپنے اوپر کوئی نہ کوئی بھوت سوار کر لو۔" فاروق بولا۔

"میرا دماغ نہیں چل گیا۔ کہ خود پر کسی بھوت کو سوار کر لوں۔" محمود نے منہ بنایا۔

"تو پھر کہانی سناؤ۔"

"اچھا سنو۔ دماغ نہ چاٹو۔ ایک تھا چڑا اور ایک تھی چڑیا..."

"اب میں اتنی بھی بچی نہیں ہوں کہ چڑے اور چڑیا کی کہانی سنوں۔" فرزانہ مسکرائی۔

"تو کیا میں اب تمھیں ہاتھی اور ہتھنی کی کہانی سناؤں گا۔" محمود نے آنکھیں نکالیں۔

"نہیں خیر۔ میں اس قدر جسامت والے جانور کی کہانی بھی نہیں سنوں گی۔ چلو تم کوئی جاسوسی کہانی سنا دو۔"

"کیا کہا۔ جاسوسی کہانی۔ ارے باپ رے۔" فاروق گھبرا گیا۔

"کیوں۔ تمھیں کیا ہوا۔ جاسوسی کہانی سن کر بخار تو نہیں ہو جائے گا تمھیں۔"

"بھئی دن رات تو جاسوسی چکروں سے نجات نہیں ملتی، آج پتا نہیں کیسے ہم فارغ بیٹھے ہیں۔ ویسے آج کا فارغ بیٹھنا بھی مجھے کھٹک رہا ہے۔" فاروق نے شوخ آواز میں کہا۔

"کیا مطلب؟" فرزانہ نے اسے گھورا۔

"مطلب یہ کہ یہ فارغ بیٹھنا ضرور کسی کیس کے شروع ہونے کے آثار ہیں۔"

"تو ہونے دو، ہمارا کیا جاتا ہے۔ کیس ہی ہے نا، شیر تو نہیں کہ ہمیں کھا جائے گا۔"

"کیس اور شیر۔ میرا خیال ہے۔ یہ نام بھی۔۔۔"

"اوہو۔ آخر تمہیں ناولوں کے ناموں کی کیوں پڑی رہتی ہے۔ یہ بات تم نے آج تک نہیں بتائی۔"

"بعض باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کی وجہ انسان نہیں بتا سکتا۔ یہ بات بھی اس قسم کی باتوں میں سے ایک بات ہے۔"

"توبہ ہے۔ کیا بات بات لگا رکھی ہے۔"

"بھئی بات بات ہی تو لگا رکھی ہے۔ بات بے بات تو نہیں۔" فاروق ہنسا۔

"حد ہو گئی۔ ایک ذرا سی کہانی سنانے کی فرمائش کیا کر بیٹھی ہوں۔ شروع ہی ہو گئے۔ ارے بھئی۔ آخر تو سوچو۔ ابا جان اور امی جان گھر میں نہیں ہیں۔ اور ہمیں ہدایت کر گئے ہیں کہ جب تک آ نہیں جاتے، اس وقت تک سونا نہیں ہے۔ اب جاگنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا، ورنہ نیند صاحبہ آئیں گی اور پھر ہم کوشش کے باوجود جاگ نہیں سکیں گے۔" فرزانہ نے جلدی جلدی کہا۔

"تو پھر ایسے موقعے کا ایک لطیفہ سن لو۔" محمود نے تنگ آ کر کہا۔

"لطیفہ تم نہیں۔ فاروق سنائے گا۔ یہ اس کا شعبہ

ہے۔" فرزانہ بولی۔

"بالکل غلط۔ یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں لطیفے سنانے کا ماہر ہوں۔"

"سنانے کے نہیں ہو تو کیا ہوا۔ چھوڑنے کے تو ماہر ہو۔"

"بھائی مجھے کانٹوں میں نہ گھسیٹو۔" فاروق شرما گیا۔

"بالکل غلط موقعے پر محاورہ بولا ہے۔ یہ اس موقعے کا ہرگز نہیں ہے۔" محمود نے فوراً کہا۔

"اب موقعے کا انتظار کون کرے۔"

عین اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ محمود نے ریسیور اٹھایا تو کسی نے دوسری طرف سے کہا:

"ہیلو مسٹر کریلا۔ کام ہو گیا یا نہیں۔"

"یہ سبزی منڈی نہیں ہے بھائی۔" محمود نے کہا اور جھلا کر ریسیور رکھ دیا۔

"کیا کوئی سبزیوں کے بھاؤ پوچھ رہا تھا؟" فرزانہ مسکرائی۔

"نہیں۔ کسی مسٹر کریلے کو پوچھ رہا تھا۔ ویسے میرا خیال ہے، ہمارے گھر میں تو کوئی کریلا نام کا آدمی نہیں رہتا۔"

"نام کا نہیں رہتا تو کیا ہوا، کریلے جیسی صفات کا تو رہتا ہے۔ اور وہ ہے فرزانہ۔"

"تمہارا مطلب تھا۔ میری باتوں میں اس قدر کڑواہٹ

ہوتی ہے۔" فرزانہ نے اسے گھورا۔

" ارے ارے — وہ کہانی رہ گئی۔" محمود نے گھبرا کر کہا۔

" تم بھول رہے ہو — کہانی کا مطالبہ تم نہیں — فرزانہ کر رہی
ہے — کیونکہ یہ ابھی چھوٹی سی بچی ہے۔"

" بھئی کہانی تو ہر عمر میں سنی جاتی ہے — بلکہ اب تو دیکھی
جاتی ہے — آخر ان فلموں اور ڈراموں میں کیا ہوتا ہے — کہانی
ہی تو ہوتی ہے۔"

" اچھا بھائی ہوتی ہوگی — تم میرے پیچھے کیوں ہاتھ دھو
کر پڑ گئے ہو — کہانی سُنو اور سو جاؤ۔" فاروق نے جل کر کہا۔

" سناؤ گے تو سوؤں گی نا — اچھا چلو محمود نہیں سناتا تو تم
سُنا دو۔"

" ضرور کیوں نہیں — یہ کیا مشکل ہے — کہانی سنانا تو میرے
بائیں ہاتھ کا کھیل ہے — غور سے سننا — میں الفاظ دہرانے
کا عادی نہیں ہوں اور چونکہ میری کہانی ہوتی بھی تیز رفتار ہے،
اس لیے میں بھی بہت تیزی سے سناتا ہوں — لہٰذا میری
کہانی کی تیزی کا ساتھ دینے کے لیے پہلے خود کو تیار کر لو۔"

" کر لیا — زیادہ باتیں نہ بناؤ اور کہانی شروع کرو۔"

" وہ رات بہت تاریک تھی — اُس دن چاند کی چودھویں تھی۔"

" دھت تیرے کی — چاند کی چودھویں کو رات تاریک کس

طرح ہو سکتی ہے۔" محمود نے جھلا کر اپنی ران پر ہاتھ مارا۔

" دیکھا — یہ ہوتے ہیں — کہانی کے دشمن — ایسے ہی
لوگوں کی وجہ سے کہانی بے چاری آگے نہیں بڑھ پاتی —
گھسٹنے لگتی ہے۔"

" ایک اعتراض کر دیا تو سیخ پا ہو گئے — لوگوں پر روزانہ
ہزاروں اعتراض ہوتے ہیں — اور وہ اُف تک نہیں کرتے۔"

" کن لوگوں پر ہزاروں اعتراض روزانہ ہوتے ہیں — ذرا
ہم بھی تو سنیں۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

" بھئی سیاسی لیڈروں پر — قومی رہنماؤں پر — مصنفوں پر۔"

" ہاں! تیری یہ بات پسند آئی — مصنفوں پر ضرور روزانہ
ہزار ہا اعتراض ہو سکتے ہیں — بشرطیکہ وہ بہت زیادہ لکھنے
والے ہوں۔"

" ہم خشک باتوں میں اُلجھ گئے — فاروق کہانی سُنا رہا تھا۔"
فرزانہ نے گویا یاد دلایا۔

" ہاں تو میں کہہ رہا تھا — وہ رات بہت تاریک تھی —
اس رات چاند کی چودھویں تھی — تاریک اس لیے تھی کہ موسم
زبردست ابر آلود تھا — کیوں — اب تو تاریک ہو سکتی ہے
یا نہیں۔"

" ہاں بھئی واقعی — اس طرح تو رات حد درجے تاریک

بھی ہو سکتی ہے۔ ایسے میں تو بے چارے سُورج کی دال نہیں گلتی۔ چاند تو ہے کِس مولی کا کھیت۔" محمود نے جلدی جلدی کہا۔

"مولی کا کھیت نہیں، کھیت کی مولی۔"

عین اس وقت فون کی گھنٹی بجی۔ محمود نے جونہی ریسیور اٹھایا، ایک بہت تیز چیخ اس کے کان میں آ گھُسی:

"ارے باپ رے۔ اس میں تو کوئی بہت خوفناک انداز میں چیخ رہا ہے۔"

"کیا۔ خوفناک چیخ۔" فارُوق چونک کر بولا۔

"کیوں۔ تمھیں کیا ہوا؟"

"وہ۔ وہی۔ ناولوں کا نام۔"

"حد ہو گئی۔ اُدھر خوفناک چیخ سنائی دے رہی ہے۔ اِدھر ان حضرت کو ناولوں کے ناموں کی پڑی ہے۔ ایک منٹ ٹھہرو۔" فرزانہ نے جھلّا کر کہا اور محمود کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں خوف اور دہشت سے پھیل گئی تھیں۔ فاروق نے فوراً فون کا ایک بٹن دبا دیا۔ اب آواز پُورے صحن میں سنائی دینے لگی۔ انھوں نے سُنا۔ وہ کسی کی آخری چیخیں تھیں یُوں لگتا تھا جیسے کسی کے سینے میں خنجر اتار دیا گیا ہو یا پھر کسی طرح سے اس کی جان لی جا رہی ہو۔

"شاید وُہ ہمیں فون کرنا چاہتا تھا، لیکن افسوس! قاتلوں نے اسے مہلت نہیں دی۔"

"ایکس چینج سے معلوم کرو۔"

ان کا نمبر ایکس چینج والوں کے پاس نوٹ تھا اور ہر وقت وہ نمبر معلوم کیا جا سکتا تھا جس سے فون کیا گیا ہو، لہٰذا دُوسری طرف سے فوراً بتایا گیا:

"فون نمبر ۴۴۳۳۲۲ ہے۔ اور یہ نمبر ایک پبلک فون بوتھ کا ہے۔ یہ فون بوتھ ساتویں سڑک پر ہے۔"

"شکریہ!" محمود نے فوراً کہا۔

وہ تیر کی طرح باہر نکلے اور پھر ان کی گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ جلد ہی گاڑی اس فون بوتھ کے سامنے رکی، اس وقت رات کے نو بجے تھے۔ اور سردیوں کا موسم تھا۔ سڑکیں اس طرح سنسان تھیں، جیسے آدھی رات ہو گئی ہو۔ وہ گاڑی سے اترے۔ فون بوتھ کا دروازہ کھولا۔ اور دھک سے رہ گئے۔ ریسیور اسی طرح لٹک رہا تھا۔ بوتھ کا فرش خون سے تر تھا۔ فون بوتھ کے باہر بھی خون موجود تھا۔ لاش غائب تھی۔ اس کا مطلب ہے، قتل کرنے والا یا والے مقتول کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ انھوں نے باریک بینی سے فون بوتھ کا جائزہ لیا۔ ریسیور پر ضرور مقتول کی

انگلیوں کے نشانات رہے ہوں گے - لہٰذا اس کو چھوا نہیں
جا سکتا تھا - ایسے میں خون میں لتھڑی کوئی چھوٹی سی سیاہ چیز
فرزانہ کو نظر آئی - وہ چمک رہی تھی - فرزانہ نے جھک کر اسے
اٹھا لیا اور اپنے رومال سے صاف کر کے دیکھا ، لیکن وہ چیز اس
کی سمجھ میں نہ آئی - اس نے سوالیہ نظروں سے محمود اور فاروق
کی طرف دیکھا - انھوں نے بھی نفی میں سر ہلا دیے ، گویا
ان کی سمجھ میں بھی بات نہیں آئی تھی - فرزانہ نے وہ چیز
جیب میں رکھ لی -

" یہاں اور کچھ نہیں ہے - قاتل کی انگلیوں کے نشانات
شاید مل جائیں اور مقتول کے بھی ۔"

" وہ قاتلوں کے آگے دوڑ رہا تھا - جب اس نے دیکھا کہ وہ
بچ نہیں سکے گا ، تو دوڑتے دوڑتے اس فون بوتھ میں گھس
گیا اور ہمیں فون کرنے کی کوشش کی - جونہی اس نے نمبر ملایا ،
قاتل نے اس کی کمر میں خنجر گھونپ دیا ۔"

" ہوں ! مشکل یہ ہے کہ وہ لاش بھی ساتھ لے گئے ہیں
اور اس طرح تفتیش میں زبردست رکاوٹ پیدا ہو گئی ہے ۔"

پولیس کو فون کر کے وہ سیدھے پروفیسر داؤد کے ہاں
پہنچے - پروفیسر داؤد انھیں دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے -

" کیوں انکل ! آپ کے چہرے پر حیرت کیوں ہے ؟"

" ابھی جمشید نے فون کیا تھا ۔"

" جی کیا مطلب - انھوں نے فون پر کیا کہا تھا ؟"

" انھوں نے کہا تھا - محمود ، فاروق اور فرزانہ یہاں آنے
والے ہیں - وہ آئیں تو ان سے کہیں یہیں رہیں - کہیں نہ جائیں ،
جب تک کہ میری طرف سے تمھیں کہیں جانے کے لیے نہ
کہا جائے ۔"

" اس میں ہمارے لیے تو حیرت کی بات ہے - آپ کے
لیے نہیں - پھر آپ کیوں حیران ہیں ؟"

" پہلے تم بتاؤ - تمھارے لیے حیرت کی بات کیوں ہے ؟"

" اس طرح ہے کہ ہم تھوڑی دیر پہلے گھر تھے - فون کی
گھنٹی بجی - ریسیور میں ایک چیخ سنائی دی - یوں لگا جیسے کسی
کو قتل کیا جا رہا ہو - ہم ایکس چینج سے معلوم کر کے اس
فون بوتھ تک پہنچے جس میں واردات ہوئی تھی - وہاں خون
پھیلا ہوا تھا ، لیکن لاش غائب تھی ، ریسیور لٹکا ہوا تھا -
ہمیں خون میں ڈوبی ایک چھوٹی سی چیز ملی - گویا اس وقت
تک ہمارا آپ کی طرف آنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا -
اس چیز کے ملنے کے بعد ہم نے آپ کی طرف آنے کا پروگرام
بنایا - اب ذرا سوچیں - جب ہم گھر سے چلے تو ابا جان اور
امی جان گھر میں نہیں تھے - انھیں کسی کے ہاں جانا تھا -

آخر انھیں یہ بات کس طرح معلوم ہو گئی کہ ہمیں آپ کے ہاں آنا ہے۔"

"یہ بات واقعی بہت زیادہ عجیب ہے، لیکن میرا حیران ہونا بھی درست ہے۔"

"وہ کیسے انکل؟"

"وہ ایسے کہ جمشید نے پہلے تو یہ پوچھا تھا کہ تم لوگوں کا فون تو نہیں آیا — میں نے بتایا کہ نہیں، پھر انھوں نے بتایا کہ وہ گھر میں نہیں ہیں، خان رحمان کے ہاں بھی نہیں ہیں — یہاں بھی نہیں ہیں، لیکن وہ یہاں آئیں گے ضرور — جب میں نے جمشید سے پوچھا کہ کیا تم لوگوں کا یہاں آنے کا پروگرام تھا — انھوں نے کہا، پروگرام نہیں تھا، لیکن پروگرام بن جائے گا اور وہ یہاں ضرور آئیں گے — میں نے پوچھا — تم یہ بات کس طرح کہہ سکتے ہو — کیا کوئی ایسی اطلاع ملی ہے، اس پر انھوں نے بتایا کہ نہیں ایسی کوئی بات نہیں — میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ اس وقت کہاں ہیں، لیکن یہاں وہ آئیں گے۔"

"واقعی — اس میں آپ کے لیے بھی حیران ہونے والی بات ہے۔"

"اب تم لوگ بتاؤ — کیا مسئلہ ہے؟"

"ہم آپ سے وہ چیز چیک کرانے آئے ہیں جو ہمیں پبلک فون بوتھ سے خون میں ڈوبی ملی ہے۔"

"اور وہ کیا چیز ہے — مجھے دکھاؤ۔"

فرزانہ نے جیب سے وہ چیز نکالی اور ان کے سامنے رکھ دی — جونہی پروفیسر داؤد کی نظر اس چیز پر پڑی — وہ زور سے اچھلے —

ان کی آنکھیں مارے حیرت کے پھیلتی چلی گئیں —

دوڑ لگا دو

انسپکٹر جمشید نے کار ایک بڑی عمارت کے سامنے روک دی
اور نیچے اُترتے ہوئے بولے :

"آؤ بیگم۔" ساتھ ہی انھوں نے چہرے پر ریڈی میڈ
میک اپ کر لیا۔

"آخر آپ مجھے کہاں لائے ہیں۔" وہ حیران ہو کر بولیں۔

"آج کا کیس میں تمھارے ساتھ شروع کر رہا ہوں بیگم۔"
وہ مسکرائے۔

"یہ آپ نے عجیب ترین بات کہی، کبھی ایسا نہیں ہوا
کہ کسی کیس کے سلسلے میں خاص طور پر مجھے اپنے ساتھ
کر چلے ہوں۔"

"اس کی وجہ ہے۔ ورنہ گھر میں محمود، فاروق اور فرزانہ
موجود ہیں، میں انھیں ساتھ لا ہی سکتا تھا، لیکن میں نے
انھیں تو اس بات کی ہوا تک نہیں لگنے دی کہ میں کس کیس

کے سلسلے میں جا رہا ہوں۔ انھوں نے یہی خیال کیا ہوگا کہ ہم
کسی گھریلو قسم کے کام سے جا رہے ہیں۔"

"اور آپ خالص جاسوسی کام سے آئے ہیں۔"

"ہاں!" وہ بولے۔

"لیکن مجھے کچھ بتا تو دیں۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔ میں تمھارے ساتھ ہی تو ہوں۔"
انھوں نے آگے بڑھ کر دستک دی۔ ایک منٹ بعد دروازہ
کھلا اور ایک ملازم کی شکل نظر آئی :

"فرمائیے۔ آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

"بیگم پاکیزہ سے۔"

"وہ وقت دیے بغیر کسی سے نہیں ملتیں۔"

"ہاں! یہ رہا میرا کارڈ۔ انھوں نے مجھے اور میری بیگم
کو ملاقات کا وقت دے رکھا ہے اور ہم بالکل وقت پر
یہاں پہنچے ہیں۔ ملاقات کا وقت ہونے میں ابھی پورا ایک
منٹ باقی ہے۔ امید ہے کہ آپ ایک منٹ تک تو ہمیں
ان تک پہنچا ہی دیں گے۔"

"میں ابھی حاضر ہوا۔" یہ کہہ کر وہ اندر کی طرف چلا گیا۔ جلد
ہی اس کی واپسی ہوئی۔

"آئیے نظامی صاحب۔ بیگم صاحبہ آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔"

دونوں اس کے پیچھے چلتے ایک کمرے میں داخل ہوئے۔
اندر ایک ادھیڑ عمر عورت صوفے میں دھنسی ہوئی تھی۔ اس نے
ہلے جلے بغیر انھیں سامنے والے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
انسپکٹر جمشید سامنے والے صوفے کی بجائے دائیں طرف بیٹھنے
کے لیے بڑھے۔

"ادھر تشریف رکھیے۔"

"کیا اس صوفے میں کوئی نقص ہے؟" انھوں نے چونک
کر کہا اور پھر اچانک لڑکھڑا کر گر پڑے۔

"ارے ارے!" بیگم جمشید گھبرا گئیں۔ انھوں نے انھیں با
سے پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی۔

"شش۔ شاید۔ میرے پاؤں میں موچ آ گئی۔" یہ کہ کر
وہ اٹھے اور دائیں طرف والے صوفے پر ہی بیٹھ گئے۔

"آپ انھیں سہارا دے کر اس صوفے پر لے آئیں۔"
پاکیزہ نے کہا۔

"آخر اس صوفے پر بیٹھنے میں کیا حرج ہے؟" بیگم جمشید
نے جل کر کہا۔

"یہ ٹھیک نہیں ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ اب مجھ سے اٹھا نہیں جا رہا۔ میں آ
کر کے ایک دو منٹ لوں گا۔"

"ہوں! فرمائیے۔ آپ کے کارڈ پر آپ کا نام عامر نظامی
لکھا ہے۔ آپ سائنس دان ہیں، لیکن مجھ سے آپ کو کیا
کام ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"آپ سے بہت اہم کام ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"خیر۔ فرمائیے۔"

"ہمارے ہاں دس فروری کو مقامی سائنس دانوں کی ایک
میٹنگ ہو رہی ہے۔ اس میٹنگ میں ہم آپ کو بطورِ مہمانِ خصوصی
بلانا چاہتے ہیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ کیا میں کوئی سائنس دان ہوں۔" اس
نے جھلا کر کہا۔

"نہیں! میں جانتا ہوں، آپ سائنس دان نہیں ہیں۔
لیکن جب بھی غیر ملکی سائنس دانوں کی کوئی میٹنگ ہمارے سائنس دانوں
کے ساتھ یہاں طے پاتی ہے۔ آپ اس میٹنگ کی مہمانِ خصوصی
ہوتی ہیں اور میزبانی کے بہت سے فرائض بھی آپ کے
ذمے ہوتے ہیں۔ لہٰذا میں نے سوچا۔ صرف مقامی سائنس دانوں
کی میٹنگ میں آپ کو کیوں نہ مہمان بلایا جائے۔"

"آپ کی معلومات قابلِ تعریف ہیں اور سن کر حیرت
بھی ہوئی۔ بات ہے بھی بالکل درست، لیکن اس کا یہ
مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مقامی سطح کی میٹنگ کی مہمانِ خصوصی

بن جاؤں۔"

"کیوں بیگم صاحبہ- کیا آپ اس ملک کی رہنے والی نہیں ہیں- آپ یہاں پیدا نہیں ہوئیں- یہاں پلی بڑھی نہیں؟"

"یہ سب باتیں ہیں- آپ کو شاید معلوم نہیں کہ میرے شوہر...؟"

"آپ کے شوہر ایک بہت بڑے سائنس دان تھے- وہ غیر ملکی تھے- یہاں اکثر آتے رہتے تھے۔ دو چار میٹنگز میں آپ اپنے والد کے ساتھ ان سے ملیں اور پھر آپ دونوں نے شادی کر لی- آپ کے شوہر نے ہمارے ملک میں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا، انھوں نے حکومت سے اس کی اجازت لے لی- اور اس دن سے آپ ایک سائنس دان کی بیوی بن گئیں، پھر آپ کے شوہر فوت ہو گئے- ان کے اعزاز میں آج بھی آپ کو اس قسم کی میٹنگوں میں مہمان بلایا جاتا ہے- میں نے کوئی بات غلط تو نہیں کہی؟"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کی معلومات حد درجے درست ہیں، لیکن میں مقامی سطح کی میٹنگ میں پھر بھی شرکت نہیں کروں گی۔"

"یہ سن کر بہت افسوس ہوا- اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ کو اپنے وطن سے کوئی محبت نہیں، لگاؤ نہیں، ہمدردی نہیں۔"

"یہ آپ کا خیال ہے۔" اس نے بُرا سا منہ بنایا۔

"خیر- اگر آپ صاف انکار کرتی ہیں تو پھر ہم چلتے ہیں، لیکن اگر آپ کا پروگرام بن جائے تو مجھے اس فون نمبر پر اطلاع دے دیجیے گا۔"

"ایسا نہیں ہوگا- میرے فیصلے اٹل ہوتے ہیں- جب میں یہ فیصلہ کر چکی ہوں کہ اس اجلاس میں شرکت نہیں کروں گی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بس میں نہیں کروں گی۔"

"شکریہ بیگم صاحبہ- کیا آپ ہمیں اپنے شوہر کی کوئی تصویر دے سکیں گی- ان کی کوئی تحریر۔"

"کیوں- اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"اس اجلاس میں ہم دراصل ان کی خدمات پر بھی بات کرنا چاہتے ہیں- ان حالات میں کم از کم ایک تصویر تو ان کی وہاں ہونی چاہیے۔"

"مجھے افسوس ہے- میرے پاس ان کی صرف ایک تصویر ہے- اور وہ میں نہیں دے سکتی۔"

"آپ ادھار دے دیں- میں لوٹا دوں گا۔"

"نہیں- میں نہیں دے سکتی۔"

"گویا آپ کسی بھی قسم کا تعاون کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں؟"

"ہاں نہیں ہوں۔"

"آؤ بیگم۔ اب یہاں رکنے کا کیا فائدہ؟"

یہ کہہ کر وہ بیگم جمشید کے سہارے سے اُٹھے اور باہر کی طرف چل پڑے۔ پاکیزہ بیگم منہ سے کچھ نہ بولی۔ بس انھیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ دروازے کے پاس رک کر انسپکٹر جمشید اس کی طرف مڑے:

"آپ نے ایک بات پر غور نہیں کیا۔"

"اور وہ کیا؟"

"میری معلومات اس سے کہیں زیادہ بھی ہو سکتی ہیں۔ آپ کے بارے میں۔" انھوں نے پُراسرار انداز میں کہا۔

"ہو سکتا ہے۔ یہی بات ہو۔ لیکن اس سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"یہ وقت بتائے گا کہ اس سے آپ کو کوئی فرق پڑتا ہے یا نہیں۔"

"کیا آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں۔ مجھے۔" اس نے پُرغرور لہجے میں کہا۔

"نہیں تو۔ اس جملے میں کوئی دھمکی تو پوشیدہ نہیں ہے۔"

"اچھا آپ تشریف لے جائیں۔ آپ نے میرا وقت برباد کیا۔"

"مجھے افسوس ہے۔" انھوں نے کہا۔

اور دونوں باہر نکل آئے۔ کار میں بیٹھتے ہی بیگم جمشید نے کچھ کہنا چاہا، لیکن انھوں نے فوراً ہی آنکھوں کے اشارے سے انھیں منع کر دیا۔ کار چل پڑی، لیکن جونہی بیگم پاکیزہ کی کوٹھی نظروں سے اوجھل ہوئی۔ انھوں نے کار روک لی۔ جیب سے ایک ننھا سا آلہ نکالا اور اس آلے کو کار کے اندر اور باہر گھمایا۔ ایک جگہ ٹن کی آواز سنائی دی۔ انھوں نے ہاتھ نیچے ڈال کر کوئی چیز نکال لی۔

وہ ایک سیاہ رنگ کا بٹن سا تھا۔ اس میں چند پنیں بھی لگی تھیں، انھوں نے اس کی پنیں نکال کر الگ کر دیں اور جیب میں رکھتے ہوئے بولے:

"اب تم جو کچھ کہنا چاہتی ہو، کہہ سکتی ہو۔ وہ ہماری باتیں سن نہیں سکے گی۔"

"تو کیا یہ آلہ اگر نیچے لگا رہتا تو وہ ہماری بات چیت سن لیتی؟" بیگم جمشید بولیں۔

"ہاں! جب ہم اس کے کمرے میں موجود تھے، اس وقت اس کے ملازم نے یہ آلہ کار کے نچلے حصے میں لگایا تھا۔"

"آخر یہ چکر کیا ہے؟"

"اس عورت پر ایک عرصے سے میری نظر ہے۔ مجھے

ہمیشہ اس بات پر حیرت ہوئی کہ غیر ملکی سائنس دانوں کا
جب بھی کوئی اجلاس ہمارے ملک میں ہوتا ہے ۔ یہ
عورت اس اجلاس کی مہمانِ خصوصی کیوں بلائی جاتی ہے ۔
معلومات حاصل کرنے پر یہ معلوم ہوا کہ اس کا خاوند ایک
سائنس دان تھا ۔ غیر ملکی تھا ۔ اور اس نے یہاں کی شہریت
اختیار کی تھی ۔ بیگم پاکیزہ سے شادی کی تھی ۔"

" لیکن ان باتوں سے آپ نے کیا اندازہ لگایا ؟" انھوں
نے پوچھا ۔

" جب مجھے کوئی بات عجیب لگتی ہے تو پھر میں اس پر
خاص توجہ دیتا ہوں ۔ میرے آدمی بہت عرصے سے اس
عورت کی خفیہ نگرانی کر رہے ہیں ۔ اور میں اس نتیجے پر پہنچا
ہوں کہ اس کی سرگرمیاں پُر اسرار ہیں ۔ ان کا نوٹس لینا
چاہیے ۔ میں نے اس سے ملاقات کا پروگرام طے کیا ۔
میں چاہتا تھا ، اپنے شک کو یقین سے بدل دوں ۔ اور
میرا شک یقین سے بدل گیا ۔"

" آخر کیسے ۔ اور ہاں ، آپ کا وہ گرنا میری سمجھ میں نہیں
آیا ۔ وہاں گرنے والی تو کوئی بات نہیں تھی ۔ میرا خیال ہے ،
آپ جان بوجھ کر گرے تھے ۔"

" ہاں بھئی ۔ یہ ٹھیک ہے ۔ دراصل وہ مجھے سامنے والے

صوفے پر بٹھانا چاہتی تھی ۔ اس کی کوئی خاص وجہ ضرور تھی ۔
ہو سکتا ہے ۔ وہاں سے کوئی ہماری وڈیو فلم بنانے کے
لیے کسی جگہ چھپا ہوا ہو ، لیکن اس جگہ سے وہ دائیں طرف
والے صوفے کو اپنے کیمرے میں نہ لے سکتا ہو ۔"

" ہوں ! اب بات سمجھ میں آ رہی ہے ۔ اب یہ بھی بتا
دیں کہ آپ کا شک یقین میں کس طرح بدل گیا ؟"

" پہلی بات تو یہی صوفے والی ۔ پھر شرکت کی دعوت
نا منظور کرنا ۔ گویا اسے ، ہمارے ملک سے کوئی دلچسپی نہیں ۔
غیر ملکی اجلاس آج ہو تو یہ وہاں اڑ کر پہنچے گی ، آخر کیوں ۔
صرف شوہر کے غیر ملکی ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے ۔
پھر میں نے اس کے بارے میں اور معلومات بھی حاصل
کیں ۔ وہ معلومات سن کر بیگم تمھاری حیرت اور بڑھ جائے
گی ۔" انسپکٹر جمشید بولے ۔

" اگر آج کا دن میرے لیے حیران ہونے کا دن ہے تو
میں کیا کر سکتی ہوں ، لیکن پہلے مجھے یہ بتا دیں کہ آپ اپنے
ساتھ مجھے کیوں لائے ۔ محمود ، فاروق اور فرزانہ کو کیوں
نہیں لائے ؟"

" ان کا بھی میک اپ کرنا پڑتا ۔ دوسرے یہ کہ ان کے
ساتھ میں میک اپ میں بھی فوراً پہچان لیا جاتا ۔"

"ہوں — اور وہ مزید معلومات کیا ہیں؟"

"بہت ہی عجیب بات ہے بیگم — ابھی بیگم پاکیزہ کی اس غیر ملکی سے شادی بھی نہیں ہوئی تھی، لیکن اس کے والد کو اس قسم کے سائنسی اجلاسوں کا مہمانِ خصوصی بنایا جاتا تھا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ارے!" ان کے منہ سے نکلا۔

"ہاں بیگم — یہ بات عجیب ترین ہے — اس کا نام سر آغا مجید تھا۔"

"پتا نہیں، کیا بات ہے — یہ باتیں سن کر میں بہت ہی بے چینی محسوس کرنے لگی ہوں۔"

"ہاں! بیگم میری بھی یہی حالت ہوئی تھی، لیکن اب نہیں، اب میں پُرسکون ہوں۔" وہ مسکرائے۔

"کیا آپ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ..."

ان کے الفاظ درمیان میں رہ گئے — اسی وقت ایک کار بہت تیزی سے ان سے آگے نکلی تھی اور پھر سڑک پر اس طرح رک گئی تھی کہ ان کا راستا پوری طرح رک گیا تھا — انسپکٹر جمشید کو خطرے کا احساس جاگا — انھوں نے فوراً بریک لگائے — پچھلا گیر لگایا اور کار کو بیک کرنے لگے — اچانک اس طرف بھی ایک کار آڑی کھڑی ہو گئی —

"گھر گئے بیگم۔" وہ مسکرائے۔

"کیا خیال ہے — دائیں بائیں نکل چلیں۔"

"نہیں بیگم — اب ان سے دو دو ہاتھ کر کے ہی چلیں گے — میں پہلے ہی بلٹ پروف گاڑی میں آیا ہوں — اور پھر ہم اندر بیٹھے بیٹھے ان پر حملہ بھی کر سکتے ہیں، لیکن پہلے یہ تو دیکھ لیں کہ وہ چاہتے کیا ہیں۔"

وہ اطمینان سے کار میں بیٹھے رہے — آخر قدموں کی آواز سنائی دی، پھر چار لمبے تڑنگے آدمی ان کے پاس آ کر رُکے:

"تم دونوں کار سے باہر نکل آؤ۔"

"ہمارا قصور۔" انسپکٹر جمشید نے کار کا دروازہ کھولے بغیر کہا، شیشہ انھوں نے اتنا سا گرا دیا تھا کہ آواز سنی جا سکے —

"ہم تمھارا سرمہ بنائیں گے۔"

"اس کا مطلب تو پھر یہ ہوا کہ ہم مر کر بھی لوگوں کے کام آ سکیں گے۔" بیگم جمشید نے خوش ہو کر کہا۔

"میں کہتا ہوں — باہر نکلو۔"

"اور اگر ہم نہ نکلے تو؟"

"تو پھر ہم تمھاری کار پر فائرنگ کر کے اس کا حلیہ بگاڑ دیں گے اور تم دونوں بھی چھلنی ہو جاؤ گے۔"

"کیا خیال ہے بیگم۔ تمھیں چھلنی ہونے کا شوق تو نہیں۔"

"اگر آپ پسند کریں گے تو میں بھی ہو جاؤں گی۔" بیگم جمشید بولیں۔

"ٹھیک ہے۔ سنو بھئی۔ ہم باہر نہیں نکلیں گے۔ تم فائرنگ کر سکتے ہو، لیکن یہ سن لو کہ جواب میں میں بھی فائرنگ کروں گا۔"

"تمھیں اتنی مہلت ہی کب ملے گی، فائر کھول دو۔" اس نے گرج کر کہا۔

اچانک کار پر چاروں طرف سے فائرنگ کی گئی۔ وہ چاروں فائرنگ کے باوجود وہیں کھڑے رہے، گویا انھوں نے بھی بلٹ پروف لباس پہن رکھے تھے۔

جب کار کا کچھ نہ بگڑا تو نزدیک کھڑے چار میں سے ایک نے ہاتھ اٹھا کر رکنے کا اشارہ کیا:

"نہیں بھئی۔ کار بلٹ پروف ہے۔ ترکیب نمبر دو اختیار کرو۔" یہ کہ وہ جلدی سے دور چلے گئے۔

"شاید اب یہ بم ماریں گے۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"تو پھر۔ اب ہم کیا کریں؟"

"اتفاق سے یہ گاڑی بم پروف بھی ہے۔" وہ مسکرائے۔

"اوہو اچھا"

اسی وقت بم کا دھماکا ہوا۔ دھماکا بہت لرزہ خیز تھا، اس سے پہلے دھماکا کرنے والے دور چلے گئے تھے۔ بم کار پر گرا اور پھٹ گیا، لیکن کار کا اب بھی کچھ نہ بگڑا۔

"اب ہم ان پر فائرنگ کریں گے بیگم۔ پہلے میں ان کی کاروں کے ٹائر بے کار کروں گا۔ تاکہ یہ فرار نہ ہو سکیں، پچھلی کار کے ٹائروں کا نشانہ تم لو گی۔"

"او کے۔" انھوں نے کہا۔

دونوں نے ایک ساتھ فائرنگ کی۔ ٹائر پھٹنے کے دھماکے گونج اٹھے:

"اب ان سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے مجھے کار سے باہر نکلنا پڑے گا۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ بلٹ پروف لباس میں ہیں۔"

"ہاں! میں جانتا ہوں۔ لیکن۔ ان سے دو دو ہاتھ کیے بغیر، ہم یہاں سے نکل نہیں سکتے۔"

"اچھا! میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"تم اندر ہی بیٹھو گی۔ بلکہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھو گی۔ اگر کوئی زد میں آئے تو آنکھ کا نشانہ لے کر فائر کر دینا۔"

"بہت بہتر۔" وہ بولیں۔

انسپکٹر جمشید نے پھرتی سے دروازہ کھولا اور باہر رینگ

گئے ۔ فوراً ہی گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی ۔ وہ لڑھکتے ہوئے سڑک سے نیچے جا گرے ۔ گویا ان کے تعاقب میں گولیاں تڑاتڑ برس رہی تھیں ۔ آس پاس کے رہنے والے دروازے بند کیے دبکے ہوئے تھے ۔ کسی مکان کی کھڑکی کھلنے کی آواز تک سُنائی نہیں دی تھی ۔

" وہ ادھر کود گیا ہے ۔" کسی نے چیخ کر کہا ۔

ایسے میں بیگم جمشید نے سب انسپکٹر اکرام کے نمبر ڈائل کیے وُہ نہ ملا تو حوالدار محمد حسین آزاد کو ہدایات دیں ۔ ادھر دشمن انسپکٹر جمشید کو گھیرے میں لینے کی کوشش کرنے لگے ۔ بیگم جمشید کو حکم تھا کہ ان کی آنکھوں پر فائرنگ کریں ، لیکن ان سب کی ان کی طرف کمر تھی ۔ انھوں نے سوچا ۔ کمر پر تو آنکھیں ہوتیں نہیں لہٰذا وہ فائر بھی نہیں کر سکتیں ۔

انسپکٹر جمشید اس وقت تک ایک درخت کی اوٹ لے چکے تھے ۔ دُوسری طرف دُشمنوں کو ان کی گولیوں سے کوئی خطرہ نہیں تھا ۔ وُہ سب بلٹ پروف لباس میں تھے ۔ لہٰذا وہ بے خوف ہو کر آگے بڑھے اور جب اس درخت کی دوسری طرف پہنچے تو انسپکٹر جمشید غائب تھے ۔ انھوں نے دوڑ دوڑ کر انھیں تلاش کیا ، اچانک جنگل میں ایک گھٹی گھٹی چیخ گونجی :

" یہ چیخ کس کی تھی ؟" کسی نے چیخ کر پوچھا ، لیکن کون بتلاتا

کہ چیخ کس کی تھی ۔ جلد ہی ایک چیخ پھر گونجی ۔

" وہ ۔۔ وہ ایک ایک کر کے ہمیں ختم کر رہا ہے ۔ وہ کوئی عام آدمی نہیں ہے ۔ ہم اس کی کار کا بھی بال تک بیکا نہیں کر سکے ۔ آؤ دوڑ لگا دو ۔" کسی نے حکم دیا ۔

دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دینے لگی ، پھر دونوں کاریں سٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی ۔ انسپکٹر جمشید مسکرائے ۔ اور ان کی طرف بڑھے ۔ جن پر ان کے ہاتھ چل گئے تھے ۔ انھوں نے دیکھا ۔ دونوں ابھی زندہ تھے اور لمبے لمبے سانس لے رہے تھے ۔

وہ چیز

"خیر تو ہے انکل! آپ تو اس چیز کو دیکھ کر اس طرح چونکے ہیں جیسے یہ کوئی بچھو ہو۔" فاروق نے گھبرا کر کہا۔

"بھئی میں منور علی خان نہیں ہوں کہ بچھو کو دیکھ کر چونک جاؤں۔ میں ایک سائنس دان ہوں اور ایک سائنس دان کسی حیرت انگیز ایجاد کو دیکھ کر ضرور چونکتا ہے۔ میں اس چیز کو ایک سائنسی اجلاس میں دیکھ چکا ہوں۔ اس لیے چونکا ہوں۔" انھوں نے جلدی جلدی کہا۔

"کیا اس چیز کو اس اجلاس میں بحث کے لیے رکھا گیا تھا انکل؟" محمود پُرجوش انداز میں بولا۔

"یہ بات نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نہیں جانتا، یہ کیا ہے۔" وہ بولے۔

"جی! یہ کیا بات ہوئی بھلا۔ ایک طرف تو آپ کہتے ہیں کہ آپ نے اس چیز کو ایک اجلاس کے دوران دیکھا تھا،

دوسری طرف کہتے ہیں کہ اس کے بارے میں کچھ جانتے تک نہیں۔"

"میں وضاحت کرتا ہوں۔ اس اجلاس میں ساری دُنیا کے بہترین سائنس دان جمع ہوئے تھے اور ہم سب نے مل کر اُڑن طشتریوں کے بارے میں غور کیا تھا۔ میں نے یہ چیز ایک سائنس دان کے کوٹ کے کالر میں لگی دیکھی تھی۔ شاید دوسروں نے توجہ بھی نہیں دی ہو گی، لیکن میں نے اس کی طرف خاص توجہ دی تھی اور آخر وقت تک یہ جاننے کی کوشش کرتا رہا تھا کہ یہ ہے کیا، لیکن میں جان نہیں سکا تھا۔"

"اور نہ آپ نے اس سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟"

"نہیں! اس اجلاس میں ذاتی باتیں کرنے کا وقت نہیں ملا تھا۔"

"ہوں۔ خیر۔ اب تو یہ آپ کے سامنے موجود ہے۔ آپ اسے چیک کر لیں اور ہمیں بھی بتائیں، یہ کیا ہے؟"

"تم لوگ ٹھہرو۔ شائستہ سے باتیں کرو۔ میں تھوڑی دیر تک آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور تجربہ گاہ میں چلے گئے۔

اسی وقت شائستہ اندر داخل ہوئی:

"ہائیں تم لوگ۔ ابّو نے کچھ بتایا ہی نہیں، بس گھنٹی بجا دی، میں نے خیال کیا۔ انھیں مجھ سے کوئی کام ہے۔"

"وہ اس وقت تجربہ گاہ میں ہیں – ایک چیز کا معائنہ کر
رہے ہیں اور ہمیں یہاں انتظار کرنا ہے – لہٰذا انتظار میں
تم ہمارا ہاتھ بٹا سکتی ہو۔" فاروق نے مسکرا کر کہا۔

"انتظار میں ہاتھ بٹا سکتی ہوں؟" شائستہ نے کھوئے کھوئے
انداز میں کہا۔

"کیوں – کیا تمھیں اب ہاتھ بٹانا بھی نہیں آتا۔" محمود نے
حیران ہو کر کہا۔

"ہاتھ بٹانا تو آتا ہے، لیکن ہاتھ انتظار میں بٹانا نہیں آتا۔"
اس نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

"خیر کوئی بات نہیں – آج ہم تمھیں یہ بھی سکھا دیں گے
تم نے یہ تو سنا ہو گا کہ انتظار کرنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔"

"صرف سنا ہی نہیں – تجربہ بھی ہے – کبھی کبھار مجھے
ابو کا بہت انتظار کرنا پڑتا ہے – اس وقت احساس ہوتا
ہے کہ انتظار کرنا کس حد تک مشکل کام ہے۔"

"چلو شکر ہے – ایک بات کا تو تمھیں تجربہ ہے – اب ذ
غور کرو – ہم اس وقت انکل کا انتظار کر رہے ہیں – اور یہ
کام ہمارے لیے مشکل ہے – اب تم اس طرح ہاتھ بٹا
سکتی ہو کہ ہماری جگہ یہ انتظار تم کرنا شروع کر دو اور ہم
کریں۔" فاروق نے جلدی جلدی کہا۔

"دماغ تو نہیں چل گیا۔" فرزانہ نے اسے گھورا۔

"نن – نہیں تو – یہ بات تمھارے ناچیز دماغ میں کس
طرح آ گئی۔"

"میرا دماغ ناچیز نہیں ہے – یہ بات بھی تم نے غلط کہی۔"

"پتا نہیں، کیا بات ہے – آج میری زبان سے کچھ غلط سلط
باتیں پھسل رہی ہیں – خیر تم ذرا اصلاح کر دو – مجھے اس
موقعے پر کیا کہنا چاہیے تھا۔" اس نے گھبرا کر کہا۔

"ایکٹنگ ضرور اچھی کر لیتے ہو۔" محمود نے منہ بنایا۔

"شکریہ بڑے بھائی – لیکن اس وقت ہم ایکٹنگ پر نہیں،
انتظار پر بات کر رہے تھے۔"

"ارے ہاں! انتظار – وہ تو رہ ہی گیا۔" محمود چونکا۔

"کہاں رہ گیا، کیا بات کر رہے ہو بھئی۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"لگ – کیا میں بھی کچھ غلط کہ گیا؟"

"چھوڑو – بات کہاں کی کہاں پہنچا دیتے ہو – شائستہ بات
صرف اتنی ہے کہ تم ہمارے ساتھ بات چیت کرو – انتظار کے
لمحات خود بخود آسان ہو جائیں گے۔"

"واہ! کتنا آسان نسخہ ہے – حیرت ہے – پھر بھی یہ کم بخت
انتظار اس قدر مشکل کیوں سمجھا جاتا ہے – لوگ ایسا کیوں نہیں
کر لیتے – کہ جونہی کسی کا انتظار کرنا پڑا – فٹ کسی دوست

کو پکڑ کر پاس بٹھا لیا۔ کہ آؤ بھئی۔ ذرا باتیں کریں۔ انتظار کی
شدت کم ہو جائے گی۔" فاروق نے رکے بغیر کہا۔

"توبہ ہے تمھاری زبان۔ انتظار بے چارہ بھی پانی بھرنے لگ
ہوگا۔" محمود نے جلا کر کہا۔

"لیجیے۔ اب انتظار صاحب پانی بھرنے لگے۔ آگے آگے
دیکھیے ہوتا ہے کیا۔"

"خیر۔ میں سمجھ گئی کہ بات کیا ہے، لیکن اس سلسلے میں
بھلا میں تمھاری کیا مدد کر سکتی ہوں۔ ہاں، الٹا تم میری مدد
کرو گے۔" شائستہ نے برا سا منہ بنایا۔

"کیا مطلب۔ شائستہ۔ یہ تم نے کیا غیر شائستہ بات کہی۔" فاروق
نے چونک کر کہا۔

"مطلب یہ کہ تم مجھے کوئی بات کرنے کی مہلت دو گے تو
میں تمھارا ہاتھ بٹا سکوں گی نا۔ اور اگر تم نے کوئی موقع ہی
نہ دیا تو ہاتھ بٹنے بٹانے کا سوال کہاں پیدا ہو سکتا ہے۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔ ہم سوال پیدا کرنے کے بھی
ماہر ہیں۔" فاروق مسکرایا۔

"کیا مطلب۔ اب تم نے سوالات بھی پیدا کرنا شروع کر دیے"
شائستہ کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

عین اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور پروفیسر داؤد اند

داخل ہوئے۔ ان کا چہرہ دودھ کی طرح سفید نظر آیا۔

"آ۔ آپ انکل۔ اندر سے پاؤڈر لگا کر تو نہیں آئے؟"

"کک۔ کیا مطلب؟" انھوں نے فوراً اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا
اور جب ہاتھ پر پاؤڈر کا نشان نہ پایا تو جلدی سے بولے:

"مذاق کر رہے ہو شاید۔"

"جی نہیں۔ آپ کا چہرہ اس وقت دودھ کی طرح سفید
ہے۔" فاروق بولا۔

"اوہ اچھا۔ خیر میں بتاتا ہوں۔ میرا ایسا رنگ اس چیز کی
وجہ سے ہوا ہے۔ اور اب الجھن ایک اور آ پڑی ہے۔"

"الجھن۔ وہ کیسے اور کہاں سے آ ٹپکی۔ ہم اس کی اچھی طرح
خبر لیں گے، آپ فکر نہ کریں۔" فاروق نے جلدی جلدی کہا۔

"یار پہلے سن تو لو۔" محمود نے تلملا کر کہا۔

"مجھے یہ بات یاد نہیں آ رہی کہ یہ چیز۔ کون سے سائنس دان
کے کالر میں لگی ہوئی تھی۔"

"لیکن اس کی کیا ضرورت پڑ گئی انکل! آپ تو یہ معلوم
کرنے گئے تھے کہ یہ چیز ہے کیا۔"

"یہ معلوم ہو جانے کے بعد ہی تو اس بات کی ضرورت
محسوس ہو رہی ہے کہ یہ کس سائنس دان کے کالر میں لگی
ہوئی تھی۔"

"آپ کا یہ مسئلہ ہم حل کر دیں گے اِن شاء اللہ ۔ پہلے آپ اس چیز کے بارے میں بتائیں۔"

"نہیں بھئی ۔ پہلے مجھے یہ بتاؤ ۔ میں کس طرح اس سائنس دان کا نام معلوم کر سکتا ہوں؟"

"اس کے لیے ہمیں اس ہال میں جانا ہو گا۔" فاروق نے فوراً کہا۔

"کیا مطلب؟"

"اور آپ کو اپنی کرسی پر بیٹھ کر بتانا ہو گا کہ وہ سائنس دان کس کرسی پر بیٹھا تھا۔"

"بہت خوب فاروق ۔ تم نے کمال کر دیا۔"

"جی ۔ لیکن ابھی کمال کہاں پیدا ہوا ہے ۔ ابھی تو ہم اس ہال میں گئے بھی نہیں۔" فاروق کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

"اوہو ۔ پہلے وہاں چلو ۔ باتیں پھر کرنا۔"

"تو پھر چلیے ۔ ویسے اسی کو کہتے ہیں ۔ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔"

"کیوں ۔ یہاں یہ مثال کس طرح دے دی تم نے؟"

"آئے تھے ہم آپ سے یہ معلوم کرنے کہ یہ محترمہ چیز ہیں کیا ۔ اور اب چلے ہیں یہ معلوم کرنے کہ وہ سائنس دان کون تھا ۔ جس نے یہ چیز اپنے کالر میں لگا رکھی ہے۔"

"بھئی ۔ بات ایک ہی ہے ۔ اب چلو۔" پروفیسر داؤد نے بُرا سا منہ بنایا۔

وہ اسی وقت اس ہال تک پہنچے ۔ پروفیسر داؤد اپنی کرسی پر بیٹھ گئے اور فوراً بولے:

"وہ اس سیٹ پر تھا۔"

"یعنی ۔ مسئلہ حل ہو گیا ۔ اب یہاں کے منتظم فوراً بتا دیں گے کہ اس سیٹ پر کس کو بٹھایا گیا تھا۔"

منتظم سے رابطہ قائم کیا گیا ۔ ان کی بات سن کر وہ بھی بہت حیران ہوا ، پھر ایک رجسٹر میں دیکھ کر اس نے بتایا کہ اس سیٹ پر پروفیسر کوٹان جان بیٹھا تھا ۔ جس کا تعلق انتارجہ سے تھا ۔

"پروفیسر کوٹان جان۔" پروفیسر داؤد بڑبڑائے ، پھر ان سے بولے:

"آؤ بھئی چلیں۔"

وہ ان کے ساتھ پھر تجربہ گاہ آئے ۔ مارے بے چینی کے ان تینوں کا بُرا حال تھا ۔ راستے میں انھوں نے اس چیز کے بارے میں پوچھنے کی بہت کوشش کی ، لیکن انھوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی ۔

"یہ معاملہ بہت خطرناک ہے بھئی ۔ حد درجے احتیاط کی ضرورت ہے ۔ جس شخص سے یہ وہاں گری ہے ۔ کہیں ہمارے آس پاس

نہ ہو۔"

ان کی بات سن کر محمود، فاروق اور فرزانہ چوکس ہو گئے اور اپنے دائیں بائیں آگے پیچھے دیکھا، لیکن کہیں تعاقب کے آثار نظر نہ آئے۔

"تعاقب تو ہمارا نہیں ہو رہا۔"

"اب تعاقب اس طرح نہیں ہوتے۔ سائنسی آلات کی مدد سے بہت فاصلے پر رہ کر بھی تعاقب ہو سکتا ہے۔" انھوں نے جواب دیا۔

"آپ کی یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔ خیر ہم تجربہ گاہ چل کر بات کریں گے۔"

"بلکہ میں تو وہاں چل کر بھی شاید کچھ نہ بتا سکوں۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"جی! یہ کیا بات ہوئی؟"

"معاملہ ہی ایسا ہے۔ جب تک میں..."

ان کے الفاظ درمیان میں رہ گئے۔ ایک کار نے آگے اچانک ان کا راستا روکا تھا۔ پہلے وہ آگے نظر نہیں آ رہی تھی، لیکن اس کا مطلب وہی تھا۔ یعنی وہ کافی آگے چل رہی تھی اور اس کو آڑا کر کے کھڑا کر دیا گیا تھا۔

"آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔"

"کیا وہ چیز آپ ساتھ لے آئے تھے؟" محمود نے گھبرا کر کہا۔

"میں اتنا پاگل نہیں۔"

"اللہ کا شکر ہے۔" فاروق نے فوراً کہا۔

"کس بات پر اللہ کا شکر ادا کیا؟" محمود چونکا۔

"اللہ کا شکر تو ہر بات پر ادا کیا جا سکتا ہے۔ ویسے اس وقت اس بات پر کیا ہے کہ انکل..."

"اتنے پاگل نہیں ہیں۔" پروفیسر داؤد مشکل سے مسکرائے۔

"نہیں انکل۔ بلکہ اس بات پر کہ آپ وہ ساتھ نہیں لائے۔" فاروق بولا۔

اسی وقت انھوں نے اپنے پیچھے بھی ایک کار کو آڑے رکتے دیکھا:

"ان لوگوں کا پروگرام نیک نہیں لگتا۔" محمود نے کہا۔

"اللہ مالک ہے۔" فاروق بولا۔

اور پھر اگلی کار سے چار لمبے قد کے آدمی ہاتھوں میں گنیں لیے ان کی کار کی طرف بڑھے۔ دو ان میں سے دائیں طرف آ کر رکے، دو بائیں طرف۔

"فون بوتھ سے خون میں ڈوبی جو چیز تم لوگوں کو ملی ہے، وہ ہمارے حوالے کر دو۔"

"افسوس! ہم وہ آپ کے حوالے نہیں کر سکتے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"کیوں، کیا ہوا؟"

"اس لیے کہ وہ ہم ساتھ نہیں لائے۔" پروفیسر داؤد نے جلدی سے کہا۔

"یہ جھوٹ ہے — وہ چیز آپ کے ساتھ ہے۔" ان میں سے ایک نے کہا۔ ساتھ ہی اس نے گن سیدھی کر لی۔

"آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ جھوٹ ہے۔ ہم تو جھوٹ پر ویسے ہی لعنت بھیجتے ہیں۔"

"اس لیے کہ ہم تجربہ گاہ کی تلاشی لے چکے ہیں۔"

"کیا!!!" پروفیسر داؤد چلائے۔ وہ فوری طور پر شائستہ کے لیے فکر مند ہو گئے تھے۔

"آپ کا رنگ کیوں اڑ گیا پروفیسر۔ اگر وہ چیز ہمیں مل گئی ہوتی تو ہم یہاں کیوں آتے؟"

"یہ بات نہیں۔ تم نے میری بچی اور تجربہ گاہ کے ملازمین کے ساتھ کیا سلوک کیا؟"

"وہ بالکل خیریت سے ہیں۔"

"خیر — بات یہی ہے کہ وہ چیز ہم ساتھ نہیں لائے تھے۔" انھوں نے کہا۔

"تو پھر سیدھے تجربہ گاہ چلیے۔ اگلی کار آپ سے آگے اور پچھلی کار آپ کے پیچھے رہے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ یونہی سہی۔"

"اور اگر وہ آپ کے پاس ہے تو پھر ہمیں ہمارے حوالے کر دیں۔ ہم آپ لوگوں کو کوئی تکلیف نہیں پہنچانا چاہتے، لیکن اگر آپ نے ہمیں کوئی دھوکا دینے کی کوشش کی۔ تو پھر ہم آپ کو اپنے راستے سے ہٹانے میں دیر نہیں لگائیں گے۔"

"آپ ہماری تلاشی لے لیں۔" محمود نے کہا۔

"لڑکے! تم نہیں بولو گے۔ ہم یہ معاملہ صرف پروفیسر صاحب سے طے کریں گے۔"

"بہت بہتر۔ اب نہیں بولوں گا۔"

وہ وہاں سے روانہ ہوئے۔ بلا وجہ ان لوگوں سے ٹکرانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ آخر تجربہ گاہ پہنچ گئے۔ اندر داخل ہونے سے پہلے ہی انھوں نے دیکھا کہ فون کے تار کاٹ دیے گئے تھے۔ گویا تلاشی واقعی لی جا چکی تھی۔ پہلے انھوں نے تار جوڑے، پھر اندر داخل ہوئے۔ چاروں لمبے آدمی ان کے ساتھ سائے کی طرح لگے ہوئے تھے۔ باقی باہر رہ گئے تھے۔

"ہاں! پروفیسر صاحب۔ اب آپ کا کیا پروگرام ہے۔ وہ چیز

ہمارے حوالے کر رہے ہیں یا نہیں؟"

"جی نہیں — میں وہ چیز آپ کے حوالے نہیں کروں گا۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"ابھی آپ ہمارے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ جرائم پیشہ لوگوں میں ہم جلاد کے نام سے مشہور ہیں۔"

"اور شریف لوگوں میں کس نام سے مشہور ہیں؟" فاروق نے پوچھا۔

"تم لوگ خاموش رہو — میں کہہ چکا ہوں — ہم ساری بات پروفیسر صاحب سے کریں گے۔"

"اوہ! میں بھول گیا تھا۔"

"پروفیسر صاحب — ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔"

"میں اس چیز کو آپ لوگوں کے حوالے نہیں کروں گا — جان جاتی ہے تو جائے۔"

"اگر ہمیں وہ چیز نہ ملی تو آپ کو اپنی جان واقعی دینا ہو گی۔" ایک نے سفاک لہجے میں کہا۔

ان کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے — کمرے میں چار چاقو کھلنے کی آواز لہرائی تھی — اب گنیں کندھوں سے لٹکا لی گئیں — اور ہاتھوں میں صرف چاقو رہ گئے — لمبے پھل والے کمانی دار چاقو — جو پیشہ ور قاتل عام طور پر اپنے ساتھ

رکھتے ہیں۔

"ہم ان چاقوؤں کی مدد سے آپ کے جسموں کا ایک ایک ریشہ الگ کر دیں گے۔ اگر آپ نے وہ چیز ہمارے حوالے نہ کی۔"

عین اس وقت دروازے کی گھنٹی نے ان سب کو چونکا دیا —

راجا

چند منٹ کی کوشش کے بعد وہ دونوں ہوش میں آ گئے۔ اب وہ ایک کمرے میں تھے اور انسپکٹر جمشید مسکراتے چہرے سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے:

"آپ - ہم کہاں ہیں؟"

"آپ لوگ وہیں ہیں - جہاں میں ہوں۔" انھوں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ہم - میرا مطلب ہے - ہم تو اس جنگل میں آپ کو تلاش کر رہے تھے۔"

"ہاں! میرا ہاتھ چل گیا تھا بس - آپ ذرا بے ہوش ہو گئے - پروگرام یہ نہیں تھا۔"

"اور ہم اب کہاں ہیں؟"

"ایک محفوظ عمارت میں - یہاں آپ کے باس یا ان کے گرگے نہیں آ سکتے۔"

"کیا واقعی۔"

"ہاں بالکل - اب آپ یہ بتائیں - آپ کو کس نے بھیجا تھا - مجھے ختم کرنے کے لیے؟"

"افسوس! ہم نہیں بتا سکتے۔"

"بھئی بتائیں گے تو تمھارے اچھے بھی۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کوشش کریں۔"

انھوں نے اپنے ماتحتوں کو اشارہ کیا - انھوں نے دونوں کو فوراً شکنجے میں کس دیا - ابھی ایک بار ہی بٹن دبایا تھا کہ پہلی بار ہی وہ چلا اُٹھے:

"ایک منٹ - ہمیں اس میں سے نکالیے - ہم آپ کے ہر سوال کا جواب دینے کے لیے تیار ہیں۔"

"میں نے کہا تھا کہ تم بتاؤ گے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

ان کے اشارے پر انھیں شکنجے سے نکال دیا گیا:

"ہاں! اب بتاؤ - یہ سب کیا چکر ہے؟"

"ہم ایک نامعلوم آدمی کے لیے کام کرتے ہیں۔"

"جو کہانی بھی سناؤ - سوچ سمجھ کر سنانا - جھوٹ ہرگز نہیں چل سکے گا اور پھر اسی شکنجے میں کس دیے جاؤ گے۔"

"نن - نہیں - نہیں۔" وہ چلائے۔

"تو پھر سب کچھ سچ اگل دو۔"

"سچ یہی ہے۔ ہم ایک نامعلوم آدمی کے لیے کام کرتے ہیں۔ اس نے تھوڑی دیر پہلے ہی ہمیں حکم دیا تھا کہ فلاں عمارت میں آپ اپنی بیگم کے ساتھ موجود ہیں۔ جونہی وہاں سے نکلیں، ختم کر دیا جائے۔"

"تو کیا تم لوگ مجھے جانتے ہو؟"

"ہاں جناب! بہت اچھی طرح۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ اب یہ بتا دو کہ اس سے تنخواہ کیا پاتے ہو اور کس طرح؟"

"بیس بیس ہزار روپے ماہوار۔ رجسٹرڈ پیکٹ ہر ماہ ملتا ہے۔ اس میں کرنسی نوٹ ہوتے ہیں۔"

"کتنے عرصے سے یہ کام کر رہے ہو؟"

"کئی سال ہو گئے۔"

"گویا کئی سال سے تم بیس ہزار روپے ماہوار حاصل کر رہے ہو۔ اب تک کتنا بچایا؟"

"بچانے کا ہمارے ہاں کوئی رواج نہیں جناب۔ کھایا پیا، اڑا دیا۔"

"حرام کی کمائی حرام راستے سے ہی ضائع ہوتی ہے۔ پیکٹ تمھیں کس پتے پر ملتے ہیں۔ پتا لکھواؤ۔"

دونوں نے دو پتے نوٹ کروا دیے:

"تو پیکٹ تمھیں اس پتے پر ملتے ہیں؟"

"جی ہاں جناب۔"

انسپکٹر جمشید نے اسی وقت سادہ لباس والوں کو فون پر ہدایات دیں اور پھر ریسیور رکھ کر ان کی طرف مڑے:

"تمھاری بات کی تصدیق یا تردید جلد ہو جائے گی۔ فکر نہ کرو۔" انھوں نے کہا۔

ان کے چہرے لٹک گئے۔ رنگ زرد پڑ گئے، شاید انھیں امید نہیں تھی کہ انسپکٹر جمشید اس حد تک تصدیق کریں گے۔

اور پھر فون کی گھنٹی بجی۔ انھوں نے بات سن کر ریسیور رکھ دیا اور ان کی طرف مڑے:

"تم دونوں کی بات درست ثابت نہیں ہوئی۔ تم نے ایک بھی رجسٹرڈ پیکٹ ان پتوں پر وصول نہیں کیا۔"

وہ خاموش رہ گئے۔ منہ سے کچھ نہ بول سکے۔

"میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ سچ اگل دو۔ تمھارے لیے دوسرا کوئی راستا نہیں۔ خیر۔ لٹکا دو بھئی انھیں پھر سے شکنجے میں۔"

"ایک منٹ! ہمیں ایک موقع اور دیں، ہم اب جھوٹ نہیں بولیں گے۔"

"اچھی بات ہے۔ کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"ہم ایک شخص کے غلام ہیں۔ اس نے ہمیں خرید رکھا ہے۔"

"کیا۔ غلام۔ آج کے دور میں بھی کیا انسان خریدے اور بیچے جاتے ہیں؟"

"ہاں! یہ کام ہوتا ہے۔ لیکن بہت خفیہ طریقے سے۔"

"اور تم لوگوں کو فروخت کس نے کیا تھا؟"

"ہمارے ماں باپ نے۔ ہم سب بھوکوں مر رہے تھے، انھوں نے اپنا ایک ایک بچّہ فروخت کر دیا۔ باقی رہنے دیے، تاکہ جو پیسے ملیں، باقی بچّوں کی پرورش کا انتظام ان پیسوں سے کیا جا سکے۔"

"تو کیا۔ یہ سارے کام تم اس شخص کے لیے کرتے ہو جس نے تمھیں بچپن میں خریدا تھا؟"

"ہاں جناب! اب ہم جھوٹ نہیں بول رہے۔ دراصل وہ بہت ظالم ہے۔ بہت زیادہ۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔ اس کا خوف ہمیں مارے ڈالتا ہے۔ اس لیے ہم اس کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاتے۔ یہ تو آپ ہمیں اس شکنجے میں نہ لٹکاتے تو ہم اس وقت بھی کچھ نہ بتاتے۔"

"اس کا نام پتا بتاؤ فوراً۔" انھوں نے منہ بنایا۔

"وہ راجا سیام کہلاتا ہے۔"

"اوہو اچھا یہ نام تو سنا ہوا ہے۔ ایک منٹ ٹھہرو۔"

یہ کہہ کر انھوں نے اکرام کو فون کیا:

"ہاں بھئی اکرام! راجا سیام کے بارے میں کیا جانتے ہو؟" انھوں نے پوچھا۔

"بدترین آدمی ہے۔ شہر میں دو تین ہوٹل چلاتا ہے۔ ان میں غنڈے قسم کے ملازم رکھے ہوئے ہیں، گاہک بھی اس کے ہوٹلوں میں غنڈے قسم کے آتے ہیں۔"

"میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ تم بھی ساتھ چلو۔"

"میں ابھی معلوم کرتا ہوں۔ وہ اس وقت کہاں ہے۔ آپ نے کہاں سے فون کیا ہے؟"

"امتحان گاہ سے۔"

"اوہ اچھا!"

آدھ گھنٹے بعد اکرام وہاں پہنچ گیا۔ ان دونوں کو ایک کمرے میں بند کر کے وہ وہاں سے روانہ ہوئے۔ اب کار اکرام چلا رہا تھا:

"وہ اس وقت ہوٹل طوری میں ہے۔"

"اور یہ اس کا اپنا ہوٹل ہے؟"

"یس سر۔" اکرام فوراً بولا۔

"آج تک گرفتار کیوں نہ کیا جا سکا؟"

"اس کے خلاف باتیں بہت مشہور ہیں، لیکن ان کے

ثبوت کوئی نہیں ہیں۔"

"ہوں۔ دیکھتے ہیں بھئی۔"

"سر۔ ویسے وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ اور صرف ہم دو آدمیوں کا وہاں جانا مناسب نہیں۔ اگر جانا ہی ہے تو پھر فورس لے کر جاتے ہیں۔"

"اس طرح وہ ہوشیار ہو جائے گا۔ ہم ریڈی میڈ میک اپ میں ہوٹل کے اندر داخل ہوں گے۔ ویسے تم فکر نہ کرو۔ میں اس سے صرف چند باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔ اگر اس نے ہمارے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا تو ہم بھی اس وقت خاموشی سے واپس چلے جائیں گے۔"

"جیسے آپ کی مرضی سر۔" اکرام بولا۔ وہ جانتا تھا، انسپکٹر جمشید کے ارادے کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ جلد ہی وہ ہوٹل کے سامنے پہنچ گئے، اس سے پہلے وہ میک اپ کر چکے تھے۔ کار پارک کرنے کے بعد وہ اندر داخل ہوئے، ان کی شکلیں بھی اب غنڈوں جیسی ہو چکی تھیں۔ دروازے پر کھڑے دو مسلح غنڈوں نے انہیں سلام کیا اور وہ اندر داخل ہو گئے۔

"میرا خیال ہے۔ پہلے ہم کچھ دیر کھانے کے ہال میں بیٹھیں گے، پھر راجا تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔"

"اس کی ضرورت نہیں سر۔ میں معلومات حاصل کر چکا ہوں۔ اس تک پہنچنا مشکل نہیں۔ بس کام زور دار ہونا چاہیے۔ آئیے میرے ساتھ۔"

وہ انہیں لے کر ایک کیبن کی طرف بڑھا، یہ کیبن شیشے کا تھا اور اس میں بیٹھا ہوا آدمی دور سے نظر آ رہا تھا۔ وہ کیبن کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گئے۔ اس نے سرسری انداز میں ان کی طرف دیکھا اور بولا:

"کیا کام ہے؟"

"راجا سے ملنا ہے۔ ایک بہت بڑا کام ان سے لینا ہے۔"

"بہت بڑے کام کی ایک جھلک؟"

"ایک لاکھ روپے کا کام تو ہو گا ہی۔" اکرام بولا۔

"یہ کام بڑا تو نہ ہوا۔" اس نے برا سا منہ بنایا۔

"تب پھر پانچ لاکھ کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"ہاں! اس رقم پر غور ہو سکتا ہے، لیکن راجا غیر قانونی کوئی کام نہیں کرتا۔ صرف قانونی کام کرتا ہے۔ یہ خیال رکھیے گا۔"

"ہم یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"ایک منٹ۔" اس نے کہا اور گھنٹی کا بٹن دبایا۔

سیاہ رنگ کا ایک آدمی جو ہاتھی جیسے ڈیل ڈول کا تھا،

جھومتا جھامتا اندر آیا اور ہانپتے ہوئے بولا:

"کیا حکم ہے؟"

"ان دونوں کو راجا کے پاس لے جاؤ۔ بتا دینا۔ مُرغی ہیں۔"

"اوہ اچھا! آئیے جناب۔"

وہ اس کے ساتھ باہر نکلے۔ اور پھر لفٹ کے ذریعے ہوٹل کی آخری منزل پر پہنچے۔ ایک بہت بڑے کمرے میں راجا کا دفتر تھا۔ اس دفتر کے ایک کونے میں ایک بڑا کمرہ تھا۔ دفتر میں کلرک قسم کا کام کرنے والے بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ سیاہ رنگ کا آدمی اس کمرے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے دستک دی:

"آجاؤ۔" ایک بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔

وہ اندر داخل ہوئے۔ ایک بہت دبلا پتلا اور تنک منک سا آدمی ایک صوفے میں دھنسا نظر آیا۔ اس نے دونوں کو سامنے والے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اسے جانے کا اشارہ کیا۔ دروازہ بند ہونے کے بعد وہ ان کی طرف متوجہ ہوا، اس کی آنکھیں گہری نیلی تھیں۔

"کیا کام ہے؟"

"ایک آدمی سے پیسے لینے ہیں۔ دیتا نہیں۔ جب کہ اس

کے پاس ہیں۔"

"یہ کون سا مشکل کام ہے۔ رقم کتنی ہے؟" اس نے خوش ہو کر کہا۔

"دو کروڑ۔"

"بس۔ صرف دو کروڑ کے لیے پریشان ہو۔ مجھے کیا دو گے؟"

"پانچ لاکھ میں بات ہو چکی ہے۔"

"نہیں بھئی۔ تم نے نیچے رقم نہیں بتائی ہوگی۔ اگر دو کروڑ کا ذکر کرتے تو پانچ لاکھ میں اوپر ہرگز نہ بھیجتا۔"

"تو پھر؟" اکرام نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"پچاس لاکھ۔ کل رقم کا ایک چوتھائی میرا ہوگا۔ تم لوگوں کی تو دو کروڑ کی رقم آخر پھنسی ہوئی ہے۔"

"نہیں راجا صاحب۔ یہ بہت زیادہ۔ بہت زیادہ۔"

"تو پھر یہ سودا نہیں ہو سکتا۔ جس راستے سے آئے ہو، اس سے واپس چلے جاؤ۔"

"آئیں بھئی۔" انسپکٹر جمشید نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

دونوں اُٹھے، لیکن پھر راجا کی ہنسی کی آواز سن کر رک گئے اور اس کی طرف مڑے۔ وہ بری طرح ہنس رہا تھا۔ اس کی ہنسی بھی بہت بھاری بھرکم تھی۔ عجیب بات تھی۔

جسم کے لحاظ سے وہ بالکل معمولی سا تھا، لیکن آواز جنگلی
بھینسے جیسی تھی۔

"خیر تو ہے۔ یہ ہنسی کیسی؟" انسپکٹر جمشید بولے۔
"تم لوگوں نے سامنے لگی سکرین کی طرف نہیں دیکھا" اس
نے ہنسی روک کر کہا۔

انھوں نے سکرین میں دیکھا اور حیران رہ گئے۔ سکرین
میں وہ دونوں صاف نظر آ رہے تھے، لیکن ان کے چہرے
میک اپ زدہ نظر نہیں آ رہے تھے۔

"ارے تو یوں کہو نا۔ انسپکٹر جمشید اور سب انسپکٹر اکرام
ہو" وہ بولا۔

"ہاں! وہی ہیں۔ تو پھر؟"

"کیسے آنا ہوا۔ تشریف رکھیے" اب اس کا لہجہ بدل
گیا تھا۔

دونوں پھر بیٹھ گئے:

"ثبوت حاصل کرنا تھا۔ کر چکے" انسپکٹر جمشید بے خوف
ہو کر بولے۔

"کس بات کا ثبوت؟" اس نے مسکرا کر کہا۔

"اس بات کا کہ تم جرائم کی زندگی گزار رہے ہو۔ اب
باقی بات پولیس ہیڈ کوارٹر میں کریں گے، اس لیے جا رہے

ہیں" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"باقی باتیں بھی یہیں کر لو انسپکٹر۔ وہاں کوئی فائدہ نہیں
ہو گا۔ ہر ماہ کتنا حصہ چاہتے ہو؟"

"اگر مجھے پہچانتے ہو تو یہ کیوں نہیں جانتے کہ میں رشوت
سے کوسوں دور بھاگتا ہوں"

"چھوٹی موٹی رشوتوں سے، لیکن جب بہت بڑی رقم
ہر ماہ ملے گی تو دوڑ کر نزدیک آ جاؤ گے۔ اس کا نصف
تمھارے نائب کو بھی ملا کرے گا۔ تم دونوں نے اس قدر
دولت خواب میں بھی نہیں دیکھی ہو گی"

"اور نہ دیکھنے کی خواہش ہے۔ ہم وہ نہیں جنھیں دولت
سے خریدا جا سکے" اکرام نے منہ بنایا۔

"میں معلوم کر چکا ہوں۔ تم کوئی فورس وورس لے کر
نہیں آئے"

"یہ میری عادت بھی نہیں" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"تو کیا اس بات کا یقین لے کر آئے ہو کہ یہاں سے
زندہ لوٹ جاؤ گے"

"ہاں بھئی۔ یہ تو ہے" اکرام مسکرایا۔

"مجھے افسوس ہے۔ اب تم دونوں یہاں سے نہیں جا
سکو گے۔ تمھارے سلسلے میں تفتیش کے لیے یہاں جو لوگ

آئیں گے، ان کا منہ میں خود بند کر لوں گا۔"

"یہاں بھی تم غلطی پر ہو۔ ہمارے سلسلے میں تفتیش کے لیے بھی وہ لوگ آئیں گے۔ جو رشوت سے کوسوں ہی دور بھاگتے ہیں۔"

"اور وہ کون ہیں؟"

"انسپکٹر کامران مرزا۔"

"میں انھیں اس قابل نہیں چھوڑوں گا کہ وہ یہاں تک آسکیں۔"

"خیر۔ یہ تو وقت بتائے گا کہ کون کسے کس قابل چھوڑتا ہے اور کس قابل نہیں۔" انسپکٹر جمشید نے منہ بنایا۔

"تم نے ابھی اپنے چاروں طرف کا جائزہ نہیں لیا۔" اس نے اطلاع دینے والے انداز میں کہا۔

"جائزہ بھی لے لیتے ہیں۔"

انھوں نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ کمرے میں ہر طرف سے رائفلوں کی نالیں جھانک رہی تھیں۔ کمرے میں یہ سوراخ وہ پہلی بار دیکھ رہے تھے۔

"یہ کیا ہے۔ یہ تو کھلونے ہیں۔ ہم دن رات ان سے کھیلتے رہتے ہیں۔ ان کو چلوا کر بھی دیکھ لو۔" انسپکٹر جمشید نے پُرسکون انداز میں کہا۔

"میں اپنا کمرہ تمھارے ناپاک خون سے گندا نہیں کروں گا۔ لے جاؤ انھیں اور اوپر سے نیچے پھینک دو۔ تاکہ نیچے گرنے کے بعد انھیں کوئی پہچان تک نہ سکے۔ شاید یہ نہیں جانتے۔ یہ اس وقت بیسویں منزل پر ہیں۔" اس نے کہا۔

"چالیسویں منزل پر بھی ہوں تو کیا فرق پڑتا ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

بیس مسلح آدمی کمرے میں داخل ہوئے اور انھیں گھیرے میں لے لیا:

"باہر نکلو۔"

"آئیے۔ جی آئیے۔" یہ کہ کر انسپکٹر جمشید اور سب انسپکٹر اکرام باہر نکل آئے۔

اب کمرہ کلرکوں سے خالی تھا۔ یعنی جو لوگ پہلے بطور کلرک کام کر رہے تھے۔ اب وہ رائفلیں لیے انھیں گھیرے میں لے کر ہوٹل کی چھت کا رُخ کر رہے تھے۔ سیڑھیاں چڑھ کر وہ چھت پر پہنچ گئے۔

"بہتر تو ہو گا کہ تم دونوں خود نیچے چھلانگ لگا دو۔ ہمیں کچھ نہ کہو۔"

"نہیں بھئی۔ خودکشی حرام ہے۔ اور حرام موت مرنا

ہمیں بالکل پسند نہیں ۔ تم لوگ آگے آؤ اور ہمیں اُٹھا کر
نیچے پھینک دو۔"

"ٹھیک ہے۔"

ان میں سے چار آگے بڑھے ۔ دو نے اکرام کو دونوں
طرف سے پکڑ لیا ۔ اور دو نے انسپکٹر جمشید کو ۔ اور لگے
منڈیر کی طرف لے جانے ۔ لیکن وہ بھلا ان سے کیا
ہلتے ۔ زور لگا کر تھک گئے ۔ تو بے بسی کے عالم میں
اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا ۔

"تم لوگ بھی آ کر ان پر زور لگاؤ ۔" ایک نے جھلّا
کر کہا ۔

اب آٹھ آدمی اور آگے بڑھے ۔ گویا اب بارہ آدمی
ہو گئے ۔ جن کو رائفلیں اپنے ہاتھ سے رکھنا پڑ گئیں ۔
چھے آدمیوں نے اکرام کو پکڑ کر جو آگے کو دھکیلا تو
وہ یک دم نیچے بیٹھ گیا ۔ اور وہ چھے کے چھے اس کے
اوپر گر کر دوسری طرف لڑھک گئے ۔ ادھر انسپکٹر جمشید
نے ان چھے کو بُری طرح جھٹک دیا ۔ وہ اِدھر اُدھر گرے ۔
اب انسپکٹر جمشید نے بجلی کی سی تیزی سے ایک رائفل
اُٹھا لی ۔

دوسرے ہی لمحے چھت فائرنگ کی آواز سے گونج اُٹھی اور

بیس آدمی بُری طرح تڑپتے نظر آئے ۔

انہیں تڑپتا چھوڑ کر وہ فوراً نیچے پہنچے ۔ اور پھر دھک
سے رہ گئے ۔

راجا اپنے کمرے میں نہیں تھا ۔

فلم

انھوں نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"اس وقت کون آ گیا؟" ان میں سے ایک نے کہا۔

"پتا نہیں۔ تجربہ گاہ کے باہر تو اس وقت تمہارے ہی آدمی ہیں۔" فاروق نے گویا انھیں یاد دلایا۔

"اوہ ہاں واقعی۔ یہ تو ہے۔" ان میں سے ایک نے کہا، پھر اپنے ایک ساتھی سے بولا:

"تم دیکھو۔ کون ہے؟"

وہ چلا گیا۔ جلد ہی واپس آیا:

"ایک صاحب ہیں۔ جو پروفیسر صاحب سے ملنا چاہتے ہیں، ہمارے ساتھیوں نے انھیں زد پر لے رکھا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ زد پر لیے ہوئے اسے بھی یہیں لے آؤ۔ کیونکہ اب اسے بھی نہیں چھوڑا جا سکتا۔"

"بہت بہتر۔" اس نے کہا اور پھر چلا گیا۔

جلد ہی وہ لوٹا۔ اس کے ساتھ آنے والے کو دیکھ کر وہ اچھل پڑے:

"ہائیں انکل۔ آپ۔"

"میرا نام انکل آپ نہیں۔ انکل خان رحمان ہے۔ بلکہ صرف خان رحمان۔ انکل تو میں تم لوگوں کا ہوں، لیکن یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔ پہلے یہ بتاؤ۔ یہ چکر کیا ہے؟"

"ایک خوفناک چکر۔"

"وہ تو خیر میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ اگر خوف ناک نہ ہوتا تو حاقو کیوں نظر آ رہے ہوتے۔ یہ لوگ چاہتے کیا ہیں؟"

"ایک شخص نے ہمیں فون کیا تھا۔ وہ ہمیں مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ ہم اس جگہ پہنچے۔ یعنی ایک پبلک فون بوتھ میں۔ فون بوتھ خون میں ڈوبا ہوا تھا، لیکن لاش غائب تھی۔ خون میں ڈوبی ہوئی ہمیں ایک چیز ملی۔ ہم نے محسوس کیا، وہ کوئی سائنس کی ایجاد ہے۔ لہٰذا وہ چیز لے کر ہم یہاں آ گئے۔ تاکہ معلوم کر سکیں کہ وہ کیا بلا ہے۔ انکل نے اس چیز کو چیک کیا۔ اب یہ لوگ وہ چیز ہم سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جب کہ ہم نہیں دینا چاہتے۔ ہمیں افسوس ہے، آپ بھی آ پھنسے۔"

"اس میں افسوس کی کیا بات۔ مجھے تو خوشی ہو رہی ہے۔"

انھوں نے خوش ہو کر کہا۔

"اب اور بھی خوش ہو جاؤ۔ تم لوگوں کا آخری وقت ہے۔ بچنے کی صورت صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ چیز ہمارے حوالے کر دو۔"

"ہم حوالے کر دیتے ہیں۔ پہلے یہ بتاؤ۔ وہ ہے کیا۔ اور فون بوتھ میں کس غریب کو قتل کیا گیا ہے؟"

"ہم سوالات کے جوابات دیتے نہیں۔ وہ چیز لینے آئے ہیں۔" ایک نے بھنا کر کہا۔

"تو پھر حاصل کر لو۔" فاروق نے کندھے اچکائے۔

"یہ لوگ اس طرح نہیں مانیں گے۔ ان کو ختم کر دیتے ہیں، پھر اطمینان سے بیٹھ کر اس چیز کو تلاش کرتے رہیں گے۔"

"قیامت تک نہیں ڈھونڈ سکو گے۔ سائنسی طریقے سے چھپائی ہے میں نے۔ لیکن اس چیز کو تو یہ لوگ بھی نہیں ڈھونڈ سکتے۔ جو کہ چیزوں کو ڈھونڈنے کے بہت ماہر ہیں۔" پروفیسر داؤد نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہوں! کوئی بات نہیں۔ ہم صرف پروفیسر کو زندہ رہنے دیتے ہیں۔ باقی لوگوں کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔"

عین اسی وقت کمرے میں کوئی چیز گری۔ اور کمرہ دھوئیں سے بھر گیا۔ ایک دھماکا بھی ہوا تھا۔ اب کمرے

میں گھپ اندھیرا ہو چکا تھا۔ کمرے میں موجود لوگ دھوئیں سے بچنے کے لیے باہر کی طرف بھاگے، لیکن پھر گرتے چلے گئے۔

ہوش آیا تو دھواں چھٹ چکا تھا۔ انھوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک طرف شائستہ بیٹھی نظر آئی۔ وہ مسکرا رہی تھی:

"ہائیں تو۔ وہ دھوئیں کا بم تم نے پھینکا تھا؟"

"ہاں! میں نے سوچا۔ کہیں وہ لوگ آپ لوگوں کو نقصان نہ پہنچا دیں۔ لہٰذا کیوں نہ دھوئیں کے بم سے کام لیا جائے۔ میں ان لوگوں کو باندھ بھی چکی ہوں۔"

"لیکن اس طرح ہم بھی تو بے ہوش ہوئے ہیں اور دھوئیں کا اثر ہمیں کئی دن پریشان رکھے گا۔" پروفیسر داؤد نے منہ بنایا۔

"تت۔ تو کیا میں نے غلط کیا؟" شائستہ گھبرا گئی۔

"ہاں شائستہ۔ ان لوگوں سے تو ہم بہت آسانی سے نبٹ سکتے تھے۔ خیر جو ہونا تھا، ہو گیا۔"

"اب جب کہ ان لوگوں کو باندھا جا چکا ہے۔ آپ ہمیں اس چیز کے بارے میں بتا دیں۔"

"پہلے میں صدرِ مملکت سے بات کروں گا۔"

"جی۔ یہ کیا بات ہوئی۔"

"تم نہیں سمجھ سکتے — میں اس وقت بہت پریشان ہوں۔"

"اللہ اپنا رحم فرمائے۔" محمود نے گھبرا کر کہا۔

پروفیسر داؤد فون کی طرف بڑھ گئے — انھوں نے جلدی جلدی نمبر ڈائل کیے، پھر بولے:

"السلام علیکم سر — معاف کیجیے گا — میں آپ کو بے وقت تکلیف دے رہا ہوں — آپ کو یاد ہو گا سر — گذشتہ دنوں دُنیا کے تمام بڑے سائنس دانوں کا ایک اجلاس ہمارے مُلک میں ہوا تھا۔"

"ہاں! بھلا یاد کیوں نہیں ہو گا۔"

"اس اجلاس میں انشارجہ کے سائنس دان کوٹان جان نے بھی شرکت کی تھی۔"

"بالکل کی تھی — وہ تو اس اجلاس کے صدر تھے۔" صدر بولے، گفتگو سب لوگ سُن رہے تھے۔

"بالکل یہی بات ہے سر — اس اجلاس کی پوری کارروائی کی فلم آپ فوری طور پر منگوا لیں — ہم آ رہے ہیں۔"

"کیا مطلب — کیا کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے؟"

"کوئی ایسی ویسی گڑبڑ — معاملہ حد درجے خوف ناک ہے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"اوہ — خیر — آپ لوگ آیئے — میں اجلاس کی فلم منگوا

رہا ہوں۔"

وہ اس وقت ایوانِ صدر کی طرف روانہ ہو گئے — جلد ہی وہ اس ہال میں داخل ہوئے — جہاں فلم دیکھی جاتی تھی، ان سب کو دیکھ کر صدر صاحب بولے:

"حیرت ہے — انسپکٹر جمشید نظر نہیں آ رہے۔"

"وہ کہیں اور مصروف ہیں — شاید بہت جلد ہم سے آ ملیں۔" پروفیسر بولے۔

"ہوں خیر — کیا فلم شروع کی جائے؟"

"جی ہاں!"

"گویا آپ پہلے تفصیل نہیں بتائیں گے۔"

"نہیں سر — پہلے میں فلم میں ایک چیز آپ کو دکھانا چاہتا ہوں۔"

فلم شروع ہوئی — سائنس دانوں کا یہ اجلاس اڑن طشتریوں کے بارے میں غور کرنے کے لیے ہوا تھا — اس اجلاس میں ہر سائنس دان نے اپنا اپنا نظریہ پیش کیا تھا — جب تمام سائنس دانوں کی تصویر بالکل صاف نظر آنے لگی تو پروفیسر داؤد بولے:

"آپ ان سب کو دیکھ رہے ہیں سر؟"

"ہاں! بالکل دیکھ رہا ہوں۔"

"اور پروفیسر کوٹان کو بھی؟"

"ہاں بالکل دیکھ رہا ہوں۔"

اب پروفیسر داؤد اٹھے اور سکرین کے پاس چلے گئے:

"پروفیسر کوٹان جان کے کوٹ کے کالر پر لگی اس چیز کو دیکھیے سر۔ بظاہر یہ ایک ننھی سی چیز ہے، لیکن یہ بہت اہم اور خوفناک ہے۔"

"آخر یہ کیا ہے؟" صدر صاحب بولے۔

"میں اب آپ کی توجہ دوسری طرف دلاتا ہوں۔ آپ ذرا اخباری نمایندوں اور دوسرے معزز حاضرین کی گیلری کی طرف بھی دیکھیں۔ اگرچہ فلم کا مرکز یہ سائنس دان ہی ہیں اور گیلری کا منظر صاف نہیں ہے۔ تاہم فلم بنانے والے نے ایک آدھ مرتبہ تو ضرور اس طرف بھی کیمرہ پوری طرح کیا ہوگا۔ آپریٹر ہمیں اس جگہ کی تلاش ہے۔ مہربانی فرما کر فلم آگے کرتے چلے جائیں۔ اور اس جگہ روک دیں جہاں کر گیلری میں بیٹھے ہوئے لوگ صاف نظر آ سکیں۔"

"او کے سر۔" آپریٹر نے کہا۔

اور فلم تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ مارے سپنس کے سب کا بُرا حال تھا۔

آخر کار آپریٹر نے ایک جگہ فلم کو روک دیا۔ گیلری

کا منظر اب ان کے سامنے تھا اور اس میں بیٹھے ہوئے لوگ صاف نظر آ رہے تھے۔

"ملاحظ فرمائیں۔ ان مہمانوں کو اور اخباری نمایندوں کو۔ یہ اس اجلاس کی کارروائی سننے کے لیے آئے ہیں۔ تاکہ اگلے دن اخبارات میں خبریں شائع کر سکیں۔ کچھ دُوسرے لوگ بھی ہیں۔ جو بڑے بڑے آفیسر ہیں اور اپنے شوق کی خاطر خصوصی اجازت ناموں کے ذریعے اس اجلاس کی کارروائی سننے آئے ہیں۔ ان سب کو غور سے دیکھیے۔ کیا آپ کو کوئی خاص بات نظر آئی ہے؟"

"خاص بات؟" ان کے منہ سے نکلا۔

"ہاں! بہت خاص بات۔ آپ غور سے دیکھیں۔" پروفیسر داؤد نے کہا۔

پھر انھوں نے ان میں سے ایک ایک کو بغور دیکھا۔ اچانک فرزانہ زور سے اچھلی۔ اس کے فوراً بعد محمود اُچھلا اور پھر فاروق۔

ان سب کے چہروں پر حیرت کے بادل چھا گئے۔ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"آخر بات کیا ہے۔ ہمیں تو کچھ نظر نہیں آیا۔" صدر صاحب حیران ہو کر بولے۔

"آپ اس طرف دیکھیے سر۔ یہاں۔" پروفیسر داؤد نے سکرین پر اُنگلی رکھ کر ہٹا لی۔

دُوسرے ہی لمحے صدر صاحب اور خان رحمان بھی زور سے اُچھلے۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

ایک الزام اور

"وہ تو بھاگ نکلا بھئی۔" انسپکٹر جمشید نے اکرام کی طرف دیکھا۔

"نہیں سر۔ وہ ہوٹل سے باہر نہیں جائے گا۔ وہ اپنے لیے ہوٹل کو بہترین پناہ گاہ سمجھتا ہے۔"

"وہ اپنے کمرے میں بیٹھا سکرین پر سب کچھ دیکھ رہا تھا، جب اس نے اپنے آدمیوں کو شکست کھاتے دیکھا تو غائب ہو گیا۔ میں سمجھ گیا۔ ہمیں اس کے کمرے کا جائزہ لینا ہو گا۔"

انھوں نے راجا کے کمرے کا اچھی طرح جائزہ لیا اور پھر میز کے نیچے انسپکٹر جمشید نے وہ خفیہ راستا تلاش کر ہی لیا:

"آؤ بھئی۔ وہ نیچے ہی کہیں مل جائے گا۔" انھوں نے دبی آواز میں کہا۔

وہ سیڑھیاں اُتر کر ایک تہ خانے میں پہنچے۔ راجا یہاں

بھی نہیں تھا۔

"یہ تو کچھ نہیں ہوا بھئی۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"اس کا مطلب تو پھر یہ ہوا سر کہ جو شخص اس سے کام لیتا رہا ہے۔ اس نے اسے غائب کر دیا، تاکہ وہ ہمیں کچھ نہ بتا سکے۔"

"ہاں! اکرام۔ وہ ہم سے زیادہ چالاک نکلا۔"

"تو پھر، اب کیا ارادہ ہے؟"

"اب تم اپنے ماتحتوں کو اوپر جا کر فون کرو، میں اس تہ خانے کا جائزہ لیتا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی اس خفیہ جگہ سے اچھی طرح واقف تھا، بلکہ اسے یہ اندازہ بھی تھا کہ اگر راجا کو بھاگنا پڑا تو وہ کس راستے سے بھاگے گا یا کہاں چھپے گا۔ لہٰذا وہ پہلے ہی یہاں پہنچ گیا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ کس راستے سے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ضرور اس تہ خانے میں کوئی اور راستا ہے۔ تم فون کر آؤ۔ میں وہ راستا تلاش کرتا ہوں۔"

"او کے سر۔" اکرام یہ کہہ کر اوپر چلا گیا۔

انھوں نے پورے تہ خانے کا جائزہ لیا۔ قدموں کے

نشان سامنے والی دیوار تک جا رہے تھے۔ وہ بھی وہیں پہنچ گئے۔ دیوار کو ٹٹولا تو اس میں ایک اینٹ کے برابر خلا تھا اور اس خلا کو اینٹوں کے رنگ کے مطابق کپڑے سے چھپایا گیا تھا۔ انھوں نے اس خلا میں ہاتھ ڈالا تو بجلی کے ایک بٹن پر انگلی لگی، انھوں نے بٹن دبا دیا۔ دوسرے ہی لمحے ایک دروازہ نمودار ہوا۔ انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ دروازے سے باہر نکل گئے۔ یہ دیکھ کر ان کی حیرت اور بڑھی کہ وہ ایک جنگل میں تھے۔ انھوں نے دروازے کے باہر کا جائزہ لیا تو وہاں بھی ایک پوشیدہ سوئچ نظر آیا۔ جب انھوں نے اس سوئچ کو دبایا تو دروازہ بند ہو گیا۔

"تو وہ اس راستے سے فرار ہوا ہے۔ اور اس کا مطلب ہے۔ اب وہ آسانی سے ہاتھ نہیں آئے گا، کیونکہ باہر نکلنے کے بعد وہ بیٹھا تو رہا نہیں ہو گا۔" وہ بڑبڑائے، پھر دروازہ کھولا اور اندر آ گئے۔ تہ خانے کا معائنہ کیا، اس کی تلاشی لی۔ لیکن وہاں کچھ نہ ملا۔ البتہ فرش پر سگریٹ کے دو ٹکڑے پڑے تھے۔ اور ایک دستانہ، جو سیاہ رنگ کا تھا۔ انھوں نے دستانے کو بغور دیکھا۔ اس کو سونگھا بھی، اس کا مطلب تھا، وہ اپنے دائیں ہاتھ میں دستانہ پہنے ہوئے تھا۔ تاکہ تہ خانے میں کسی بھی چیز پر انگلیوں کے

نشانات نہ آجائیں۔

انھوں نے دستانہ اور سگریٹ کے ٹکڑے اپنے پاس محفوظ
کر لیے۔ اور پھر اکرام اپنے ماتحتوں کو ساتھ لیے وہاں پہنچ گیا:

"اکرام! تم انھیں ہدایات دے دو اور خود میرے ساتھ چلو،
ہمیں ایک جگہ جانا ہے۔"

"اوکے سر۔ کیا کوئی اور راستا ملا ہے؟"

"ہاں! قاتل جس راستے سے فرار ہوا ہے۔ میں نے وہ تلاش
کر لیا ہے۔ اس جگہ سے تو خاص طور پر انگلیوں کے نشانات
اٹھانے ہیں۔"

ہدایات دینے کے بعد وہ اسی خفیہ راستے سے باہر نکلے۔
چکر کاٹ کر پارک کی طرف آئے اور کار میں بیٹھ کر روانہ ہوئے:

"جانا کہاں ہے سر؟"

"آج میں ایک عورت سے ملا تھا۔ اس سے ملنے کی دیر
تھی کہ عجیب وغریب واقعات شروع ہو گئے۔ مجھ پر حملہ کیا گیا،
حملہ آور جب میرے قابو میں آگئے تو انھوں نے بتایا کہ وہ
راجا کے آدمی ہیں، لہٰذا میں نے تمھیں ساتھ لیا اور راجا
سے ملاقات کی، لیکن اس ملاقات کا نتیجہ اور بھی خوفناک
نکلا۔ راجا کو ہلاک کر دیا گیا۔ اب ہم یہ کس سے پوچھیں کہ
یہ سب کیا ہے؟"

"ظاہر ہے۔ آپ اس عورت سے پوچھیں، جس سے ملاقات
کرتے ہی یہ واقعات پیش آئے ہیں۔"

"تم نے ٹھیک کہا اکرام۔ ہم اسی طرف جا رہے ہیں۔"

"اور اس عورت کا نام کیا ہے سر؟"

"بیگم پاکیزہ۔" وہ بولے۔

"کیا!" اکرام زور سے چلّا اٹھا۔

"کیوں کیا ہوا۔ تم اس قدر زور سے کیوں چلّائے؟" ان
کے لہجے میں حیرت تھی۔

"تو آپ بیگم پاکیزہ سے ملے تھے۔" اکرام نے کھوئے کھوئے
لہجے میں کہا۔

"ہاں بالکل!"

"لیکن کیوں۔ آپ کو کیا ضرورت محسوس ہوئی تھی؟"

"اس نے ایک غیر ملکی سائنس دان سے شادی کی تھی۔
غیر ملکی سائنس دان یہیں کا شہری بن گیا تھا۔ جب بھی باہر
سے غیر ملکی سائنس دانوں کا کوئی وفد آتا۔ تو یہ میاں بیوی ان
کا استقبال کرتے۔ ان کی خاطر مدارت کرتے تھے۔ پھر وہ
مر گیا اور اب یہ وہی کام کرتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ غیر ملکی
سائنس دانوں کو آخر اس عورت کی اس قدر فکر کیوں ہے۔
اس سے اس قدر ہمدردی کیوں ہے، یہ بات مجھے بہت

عجیب سی لگتی ہے ، لہٰذا میں بیگم پاکیزہ سے ملا ، تاکہ دیکھوں،
وہ عورت کیسی ہے۔ اس سے مُلاقات کے نتیجے میں ہم پر
راجا سیام کے غنڈوں نے حملہ کیا۔ وُہ اس کے زر خرید
غلام تھے۔ ان سے معلومات حاصل کرکے ہم ہوٹل نوری
پہنچے۔ لیکن راجا سیام بھاگ نکلا۔ اب تم بتاؤ۔ تم بیگم پاکیزہ
کا نام سُن کر کیوں چونکے؟"

"یہ عورت بہت جوڑ توڑ والی ہے۔ اس کا اثر رسوخ
بہت بڑے بڑے آفیسرز سے ہے۔ کتنے ہی محکموں میں اس
کا حکم تک چلتا ہے۔ جس کو چاہے، سفارش کرتی ہے اور جس
کو چاہے، ملازمت سے نکلوا بھی دیتی ہے۔"

"لیکن محکمے کے ذمے دار لوگ اس کا حکم کیوں مانتے ہیں؟"

"یہ بات آج تک میری سمجھ میں بھی نہیں آئی۔"

"خیر۔ اب ہم اس سے دوبارہ ملنے جا رہے ہیں۔
پہلے میں بیگم کو ساتھ لے کر گیا تھا، اب تم ساتھ ہوگے۔"

"اس سے ملاقات کرکے کہیں ہم خطرات نہ مول لے لیں۔"

"خطرات ہم مفت کب لیتے ہیں، ہمیشہ مول ہی لیتے ہیں۔"
انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

اکرام شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ آخر ان کی کار بیگم پاکیزہ
کی کوٹھی کے سامنے رکی۔

"بیگم کے ساتھ میں میک اَپ میں ملا تھا۔ اب ہم اپنے
اصلی چہروں کے ساتھ ملاقات کریں گے۔"

اکرام نے سر ہلا دیا۔ اور گھنٹی کے بٹن پر اُنگلی رکھ دی،
جلد ہی اسی مُلازم نے دروازہ کھولا اور ان کا کارڈ لے کر
چلا گیا۔ اس مرتبہ وہ بہت جلد واپس آیا اور بولا:

"آئیے انسپکٹر صاحب۔"

وہ اس کے ساتھ چلتے اسی کمرے میں داخل ہوئے۔

"اس طرف تشریف رکھیے۔" بیگم پاکیزہ نے اسی صوفے کی
طرف اشارہ کیا جس پر پہلے بٹھانے کی کوشش کی تھی۔ انھوں
نے جیسے سنا ہی نہیں اور دوسرے صوفے پر بیٹھ گئے۔
بیگم پاکیزہ تلملا کر رہ گئی، پھر خود پر قابو پا کر بولی:

"فرمایئے! میں کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

"آپ راجا سیام کو جانتی ہیں؟"

"راجا سیام۔ جی نہیں۔ اس نام کے آدمی کو میں نہیں
جانتی۔" بیگم پاکیزہ نے کہا۔

"ہو سکتا ہے، آپ اسے کسی اور نام سے جانتی ہوں۔ لہٰذا
میں اس کا حلیہ آپ کو بتاتا ہوں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ
یہ بتاتا ہوں کہ وہ ہوٹل نوری کا مالک ہے۔ بہت سے
غنڈے پال رکھے ہیں اس نے۔ جو اس کے زرخرید غلام

ہیں - ان غنڈوں کے ذریعے وہ دوسروں کے کام کراتا ہے
اور ان لوگوں سے بڑی بڑی رقمیں وصول کرتا ہے - اب اس
کا حلیہ سنیں - چھوٹا قد، سانولا رنگ - ناک کی نوک پر بڑا سیاہ
تل - آنکھیں بھوری - ٹھوڑی نوک دار - بہت پتلا دبلا اور تنک
منک سا آدمی - کیا آپ اس حلیے کے کسی آدمی کو جانتی ہیں؟"

"جی نہیں۔"

"کیا ہم یہاں سے ایک فون کر سکتے ہیں؟"

"ضرور - کیوں نہیں - لیکن آپ نے اپنی آمد کا مقصد نہیں
بتایا۔" وہ بولی۔

"ابھی بتاتا ہوں - اکرام ذرا آزاد کو فون کر دو۔"

اکرام اس جملے کا مطلب سمجھ گیا - وہ اٹھ کر فون کے پاس
گیا اور نمبر ملا کر بولا:

"آزاد! ہم اس وقت بیگم پاکیزہ صاحبہ کے ہاں ہیں۔" یہ
کہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

"یہ کیا اطلاع دی آپ نے کسی کو؟"

"بتایا ہے کہ ہم کہاں موجود ہیں - ہو سکتا ہے، ہماری
ضرورت پیش آ جائے - وہ ہمیں فون تو کر سکیں گے۔"

"تو کیا آپ کا یہاں زیادہ دیر کا پروگرام ہے؟"

"اتنی زیادہ دیر کا بھی نہیں - ویسے کیا آپ بتا سکتی

ہیں، اس وقت آپ کی کوٹھی میں آپ کے علاوہ کتنے آدمی ہیں؟"

"ہاں کیوں نہیں - میرے علاوہ تین ملازم ہیں اور بس۔"

"شکریہ! گویا آپ اکیلی ہیں۔"

"ہاں! جب میں نے مسٹر جارج سے شادی کی تھی تو میرے
گھر والوں نے مجھ سے تعلق ختم کر لیا تھا - آج تک وہ
مجھ سے نہیں ملے اور نہ مرتے دم تک ملیں گے، مجھے بھی
ان سے ملنے کی کوئی آرزو نہیں ہے۔" اس نے سرد آواز
میں کہا۔

"آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں - آپ اپنے شوہر
کے ساتھ سائنس دانوں کے ہر اجلاس میں شرکت کرتی رہی
ہیں - ان کی وفات کے بعد بھی آپ کو اس قسم کے اجلاسوں
میں بلایا جاتا ہے، اس کی وجہ؟"

"اس کی کوئی وجہ نہیں - وہ لوگ بس میرا احترام کرتے ہیں۔"

"اس مرتبہ جو آخری اجلاس ہوا، اس میں بھی آپ نے شرکت
کی تھی؟"

"ہاں! کی تھی - بلکہ میں اجلاس کی مہمانِ خصوصی تھی۔"

"شکریہ! آپ نے بتایا ہے کہ آپ کے گھر میں تین ملازم
ہیں - چند روز پہلے یا ایک روز پہلے تک کتنے تھے؟"

"کیا مطلب؟" وہ چونکی۔

"میں نے ایک بہت سادہ سی بات پوچھی ہے - ملازمین کی تعداد کیا تین ہی رہی ہے یا پہلے چار تھی؟"

"ہاں ! پہلے چار تھی۔"

"ایک کہاں گیا؟"

"اس نے ملازمت چھوڑ دی۔"

"اس کا نام — وہ کہاں چلا گیا؟"

"نام خالد سرومی تھا - کہاں گیا، کچھ پتا نہیں۔"

"اس کے گھر کا پتا تو دے ہی سکیں گی آپ۔"

"اس نے جو ملازمت کی درخواست دی تھی، اس پر پتا لکھا ہوگا، وہ میں نکلوا دیتی ہوں۔"

"بہت بہت شکریہ!" انھوں نے کہا۔

بیگم پاکیزہ نے گھنٹی بجائی - وہی ملازم اندر داخل ہوا:

"ملازمین والی فائل میں سے خالد سرومی کی درخواست نکال لاؤ۔"

"جی بہتر!" اس نے کہا اور چلا گیا۔

جلد ہی وہ درخواست نکال لایا، پاکیزہ نے ان کے حوالے کر دی - اس پر ایک نظر ڈال کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے:

"آؤ بھئی چلیں۔"

"جی کیا فرمایا - چلیں۔" اکرام نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں ! اور کیا - اب یہاں ہمارا اور کیا کام رہ گیا ہے۔"

"اور وہ - راجا سیام سر۔"

"اوہ ہاں ! اسے تو میں بھول ہی گیا - خیر تم کہتے ہو تو اس سے بھی دو دو باتیں کر لیتے ہیں - آزاد کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"ایک منٹ باقی ہے۔"

"ٹھیک ہے - محترمہ بیگم پاکیزہ صاحبہ - آپ کا بیان ہے کہ آپ کسی راجا سیام نام کے آدمی کو نہیں جانتیں - آپ کو اس نام کے آدمی کا حلیہ بھی بتا دیا گیا ہے - لہٰذا راجا سیام یہاں تو ہو نہیں سکتا۔"

"یہاں اس کا کیا کام۔" اس نے جل کر کہا۔

"مہربانی فرما کر تینوں ملازمین کو یہاں بلا لیں۔"

"آخر آپ کرنا کیا چاہتے ہیں؟"

"بس دیکھتی جائیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

اس نے گھنٹی بجائی - ایک ملازم اندر داخل ہوا۔

"باقی دو کو بھی بلا لاؤ۔"

"جی بہت بہتر۔"

جلد ہی تینوں ملازم کمرے میں نظر آئے، ان کے چہروں پر حیرت ہی حیرت تھی -

"اب آپ کی کوٹھی میں اور تو کوئی نہیں ہے؟"

"نہیں ہے۔" اس نے جھلا کر کہا۔

"اور کوٹھی کے دروازے اندر سے بند ہیں۔ بند ہیں نا؟" وہ ملازموں کی طرف مڑے۔

"جی ہاں! بند ہیں۔" ملازم بولے۔

"شکریہ۔ اکرام! جاؤ۔ اپنا کام کرو، میں یہیں ٹھہروں گا۔"

"او کے سر۔" اس نے مسکرا کر کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

"یہ کیا۔ آپ نے اپنے ساتھی کو کہاں بھیجا ہے۔ آپ میری کوٹھی میں یہ کیا گڑبڑ کر رہے ہیں؟"

"آدمی ہی بھیجا ہے۔ کوئی درندہ تو نہیں بھیجا۔ جو ٹوٹ پھوٹ مچا دے گا۔"

"پتا نہیں، یہاں کیا ہونے والا ہے۔" بیگم پاکیزہ بڑبڑائی۔

اچانک اکرام راجا سیام کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ راجا سیام کا چہرہ لٹکا ہوا تھا:

"یہ۔ یہ۔ یہ کیا؟" بیگم پاکیزہ چلائیں۔

"بہت خوب! اب انجان بن رہی ہیں۔ اسے اپنے گھر میں پناہ دے رکھی تھی۔"

"مم۔ میں نے۔ نہیں تو۔ میں نہیں جانتی۔ یہ کون ہے۔ اسے تو آپ اپنے ساتھ لائے ہوں گے۔" اس نے چلا کر کہا۔

"کیوں بھئی۔ تمھیں ہم ساتھ لائے تھے؟"

"نن۔ نہیں۔" اس نے گھبرا کر کہا۔

"یہ۔ یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو۔ اور کیا میں نے تمھیں یہاں چھپا رکھا تھا؟"

"ہاں اے مکار عورت۔ تم نے تو کہا تھا، اس تہ خانے تک کوئی نہیں پہنچ سکے گا۔ یہ تو بہت آسانی سے وہاں پہنچ گئے۔"

"خاموش اُلو کے پٹھے۔" وہ چلائی۔

"اب چلانے کا کوئی فائدہ نہیں بیگم صاحبہ۔ آپ کو گرفتار کیا جاتا ہے۔"

"کس جرم کی بنا پر؟"

"قانون کے اس مجرم کو پناہ دینے کی بنا پر۔ میں پہلے ہی آپ سے پوری طرح پوچھ چکا تھا کہ اس حلیے اور نام کے آدمی کو تو نہیں جانتیں اور یہ کہ اس کوٹھی میں آپ کے اور ملازمین کے علاوہ کوئی اور تو نہیں ہے۔ آپ صاف انکار کرتی رہیں، اب یہ یہاں سے برآمد ہوا ہے تو اس کا صاف مطلب ہے، آپ نے اسے پناہ دے رکھی تھی۔ وہ بھی کسی عام کمرے میں نہیں۔ تہ خانے میں۔ خفیہ تہ خانے میں۔" وہ کہتے چلے گئے۔

"ان باتوں کا گواہ کون ہے۔ میں اور میرے ملازمین صاف

انکار کرتے ہیں۔ ہم اس شخص کو بالکل نہیں جانتے۔ آپ دونوں
تو اسے اپنے ساتھ لائے تھے۔"

"بہت خوب۔ اکرام۔ ذرا ٹیپ ریکارڈر تو آن کرو۔"

اکرام نے گھڑی میں لگا ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا۔ وہ گفتگو
جو یہاں کی جا چکی تھی۔ سنائی دینے لگی۔ اب تو بیگم پاکیزہ
کا رنگ اڑ گیا۔ پھر اس نے اکڑ کر کہا:

"اس کے باوجود آپ مجھے گرفتار نہیں کر سکتے۔ میری ایک
حیثیت ہے۔"

"وہ آج ختم ہو گئی۔"

"ہرگز نہیں۔ مجھے اپنے وکیل کو فون کرنے دیا جائے۔
یہ میرا قانونی حق ہے۔"

"آپ فون ضرور کریں۔"

وہ اٹھ کر فون کے پاس گئی اور نمبر گھمانے لگی۔ فون پر
بات کر کے وہ واپس پلٹی:

"میرے وکیل بس آیا ہی چاہتے ہیں۔ آپ کو انتظار
کرنا ہو گا۔"

"اور ہمارا کام ہی کیا ہے۔" اکرام نے منہ بنایا۔

"بیگم صاحبہ۔ آپ نے اپنے ملازم خالد سرومی کو نکال دیا،
آپ نے اس کا نام اور پتا ہمیں فائل سے نکال کر دیا ہے۔

یہ بات ٹھیک ہے۔"

"جی ہاں! بالکل ٹھیک۔"

"میرے آدمیوں کی رپورٹ یہ ہے کہ یہ شخص کل تک آپ
کی کوٹھی میں موجود تھا۔"

"اوہ! تو آپ میری کوٹھی کی نگرانی کراتے رہے ہیں؟"

وہ چونکی۔

"ہاں! اب آپ کیا کہتی ہیں؟"

"یہ کہ۔ اسے میں نے کل ہی فارغ کیا تھا۔"

"جاتے وقت وہ آپ کی کوئی چیز تو نہیں لے گیا؟"

"چیز۔ اوہ ہاں! وہ میری ایک بہت اہم چیز چرا کر لے
گیا ہے۔"

"آپ نے اس چیز کے بارے میں کیا کیا؟"

"میں نے اپنے آدمی..."

"ہاں ہاں۔ کہیے۔ رک کیوں گئیں؟"

"میں رپورٹ درج کراؤں گی اس کے خلاف۔ ابھی مجھے
وقت نہیں ملا۔"

"اس چیز کا نام۔ جو وہ لے گیا ہے؟"

"اس چیز کا نام۔ آپ کو اس سے کیا مطلب؟"

"نام بھی بتا ہی دیں۔ تو بہتر ہے۔"

"نہیں بتا سکتی - وہ ایک ایسی ہی چیز ہے۔" اس نے تنگ آ کر کہا۔

"اچھی بات ہے - میں آپ کو ایک چیز دکھاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید نے جیب میں ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔

"میرے وکیل صاحب آ گئے۔" اس نے چہک کر کہا اور باہر کی طرف دوڑی، لیکن اکرام اس کے راستے میں آ گیا:

"محترمہ - آپ نہیں - میں جا کر دروازہ کھولوں گا - آپ یہیں ٹھہریں۔"

"اوہ اچھا۔"

"اکرام - احتیاط سے - ہو سکتا ہے، ان محترمہ نے وکیل کی بجائے اپنے غنڈے بلائے ہوں۔"

"اُف توبہ - تو میں نے غنڈے پال رکھے ہیں۔" اس نے جھلا کر کہا۔

"ایک غنڈہ تو راجا سیام کی صورت میں آپ کے سامنے موجود ہے۔"

"یہ آپ کو غنڈہ نظر آتا ہے - اس قدر چھوٹی جسامت کا آدمی غنڈہ ہو سکتا ہے۔"

"ہاں! ہو سکتا ہے، اگر اس نے اپنی مدد کے لیے اور

بہت سے غنڈے پال رکھے ہوں اور جب وہ آپ کے اشاروں پر ناچے گا اور پھر گویا ان غنڈوں کو آپ نے ہی پال رکھا ہے۔"

اسی وقت درمیانے قد کا ایک بھاری بھر کم جسم والا آدمی اکرام کے ساتھ اندر داخل ہوا:

"مجھے رازی خاں کہتے ہیں، شہر کا مشہور وکیل ہوں - محترمہ بیگم پاکیزہ میری مؤکلہ ہیں - ان کے خلاف کیا الزامات ہیں، آپ انہیں کیوں گرفتار کرنا چاہتے ہیں؟"

انسپکٹر جمشید نے ٹیپ ریکارڈر والی گفت گو اسے سنادی - اور بولے:

"اب فرمائیے - آپ کیا کہتے ہیں؟"

"یہ آواز محترمہ بیگم پاکیزہ کی نہیں ہے - کسی نے ان کی آواز کی نقل اتاری ہے اور آپ نے یہ سارا ڈراما کھیلا ہے۔" وکیل نے کہا۔

"بہت خوب! اسے کہتے ہیں وکالت - اب جواب دیں انسپکٹر صاحب۔" بیگم پاکیزہ خوش ہو کر بولی۔

"ہاں! میں جواب دوں گا - اکرام میری طرف سے تم جواب دے دو - ذرا وڈیو فلم بھی چلا دو۔"

دوسرے ہاتھ پر بندھی گھڑی نما ٹی وی اکرام نے آن کر دیا - اس پر بیگم پاکیزہ کی آواز سنائی دینے لگی، لیکن اب تصویر

خود بول رہی تھی۔

"اب اس ثبوت کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"میں عدالت میں آپ کو دیکھ لوں گا۔" وکیل نے جل کر کہا۔

"ہوں۔ اچھا۔ اس کا مطلب ہے، ان کی گرفتاری کی آپ اجازت دے رہے ہیں۔"

"آپ نہیں جانتے کسے گرفتار کر رہے ہیں۔ آپ کی حکومت ہل جائے گی۔"

"کوئی پروا نہیں۔"

"بیگم صاحبہ۔ آپ ان کے ساتھ بے فکر ہو کر چلے جائیے۔ میں دیکھ لوں گا۔ صرف آدھ گھنٹے بعد آپ باہر ہوں گی۔"

"ایک منٹ۔ ابھی مجھے ان پر ایک سنگین الزام اور لگانا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ اچھل پڑے۔

فکر کی قسمیں

پروفیسر داؤد نے پروفیسر کوٹمان جان کے کالر کی طرف اشارہ کیا تھا، پروفیسر کوٹمان جان کے کالر میں بالکل ویسی سیاہ رنگ کی چیز لگی تھی۔ جو انہیں فون بوتھ سے ملی تھی۔

"آپ اس سیاہ رنگ کے بٹن کو دیکھ رہے ہیں۔ یہ بالکل گول ہے۔ اور ایک جگہ سے قدرے ابھرا ہوا ہے۔"

"ہاں! لیکن یہ کیا ہے؟" صدر صاحب نے حیران ہو کر کہا۔

"ابھی بتاتا ہوں۔ پہلے آپ سکرین پر اس طرف دیکھیے۔"

یہ کہ کر انھوں نے پھر ایک جگہ انگلی رکھی۔

"ارے! یہ کیا۔ یہ تو۔ محترمہ بیگم پاکیزہ ہیں۔ اور۔ اور ان کے بالوں میں بھی بالکل ویسی گول چیز لگی ہوئی ہے۔" صدر صاحب نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"جی ہاں! اور اب ذرا ان لوگوں میں سے ایک صاحب کی طرف دیکھیے۔ جو تماشائیوں کی گیلری میں بیٹھے ہیں۔"

"اُف مالک — یہ — یہ انشارجہ کے سفیر ہیں اور ان کے کوٹ کے کالر میں بھی — وہی سیاہ بٹن سا — آخر یہ بٹن کیا بلا ہے؟"

"یہ دیکھیے — وہ بلائیں آپ کو دکھاتا ہوں۔" یہ کہہ کر پروفیسر داؤد نے کسی خفیہ جیب سے وہ گول سی چیز نکال کر ان کے سامنے رکھ دی۔

وہ اس پر جھک گئے اور حیرت بھری نظروں سے دیکھنے لگے، پھر بولے:

"اور آپ کو یہ کہاں سے ملی؟"

"مجھے نہیں — اس کا سہرا ان تینوں کے سر ہے — اگر یہ اس چیز کو خون میں سے نکال نہ لاتے تو شاید اس قدر خوفناک راز سے کبھی پردہ نہ اٹھتا۔"

"خوفناک راز — خون میں ڈوبی چیز — مہربانی فرما کر مجھے تفصیل سے سنائیے۔"

"ضرور کیوں نہیں۔"

اب انھیں ساری کہانی سنائی گئی۔

"چلیے یہاں تک تو تفصیلات معلوم ہوگئیں — اب رہ گئی یہ چیز۔"

ان کے الفاظ درمیان میں رہ گئے — اس وقت انھیں

فون پر اطلاع دی گئی کہ کوئی بہت اہم شخصیت ان سے فون پر بات کرنا چاہتی ہے۔

وہ فون کی طرف متوجہ ہو گئے اور پھر انھوں نے ان کی پیشانی پر لکیریں ابھرتی محسوس کیں — آخر ریسیور رکھ کر وہ ان کی طرف مڑے:

"ہم یہ کام پھر کسی وقت کریں گے — اس سارے ریکارڈ کو محفوظ کر لیا جائے — پروفیسر صاحب — آپ لوگ بھی تشریف لے جائیں۔"

"کیا کوئی خاص بات ہو گئی سر؟"

"ہاں! بہت خاص — بتا نہیں سکتا — اس وقت آپ چلے جائیں۔"

انھوں نے پریشان ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور باہر نکل آئے:

"یہ کیا ہوا؟" پروفیسر داؤد بولے۔

"ضرور کوئی خاص بات ہو گئی ہے — بلکہ کوئی خاص گڑبڑ ہو گئی ہے۔" محمود نے کہا۔

"پروفیسر صاحب! آپ ہمیں تو بتا دیں کہ...؟"

"بھئی ابھی ٹھہرو — دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں — تجربہ گاہ پہنچ کر ہی کچھ بتا سکوں گا۔"

"بہت بہتر۔ یونہی سہی۔" فاروق نے کندھے اچکائے۔

وہ تجربہ گاہ پہنچے اور پھر دھک سے رہ گئے۔ شائستہ پتھر کے بت کی مانند تجربہ گاہ کے درمیان میں کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں بالکل بند تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کھڑی کھڑی گہری نیند سو گئی ہو۔ وہ اس کی طرف دوڑے۔ اور اسے تھام لیا، پھر صوفے پر لٹا دیا۔ اس کی آنکھیں اب بھی بند رہیں۔

"یہ۔ یہ تو مکمل طور پر بے ہوش ہے۔ حیرت ہے۔ پھر یہ کھڑی کیسے رہ گئی؟"

"تم لوگ بھی بے ہوش ہو جاؤ گے اور اسی طرح کھڑے کے کھڑے رہ جاؤ گے۔"

ہال میں ایک آواز ابھری۔ وہ چونک کر مڑے۔ وہاں دس مسلح آدمی موجود تھے۔ ان کے ہاتھوں میں جدید ترین رائفلیں تھیں۔

"تو وہ چیز تم اپنے ساتھ لے گئے تھے پروفیسر کے بچے۔"

"ہاں! تم لوگوں کو کس طرح اطلاع مل گئی۔ ویسے اطلاعاً عرض ہے کہ میرے والد پروفیسر نہیں، ایک ڈاکٹر تھے۔" انھوں نے چمک کر کہا۔

"ایوانِ صدر میں جو کارروائی ہوئی، ہمارے علم میں ہے۔ اسی لیے تو عین وقت پر اس کارروائی کو رکوا دیا گیا۔"

"کیا مطلب؟" پروفیسر داؤد زور سے اچھلے۔

"ہم اس ملک میں جو چاہیں، کر سکتے ہیں۔ اس بات سے ہی اندازہ لگا لیں۔"

"اس کا مطلب ہے۔ ایوانِ صدر میں ہونے والی ہر کارروائی تم لوگوں کے علم میں ہوتی ہے؟"

"ہاں! پتا ہے۔ اس وقت صدر صاحب کو کس کا ٹیلی فون موصول ہوا تھا؟"

"انشارجہ کے صدر کا۔" محمود نے کہا۔

"اوہ! تو تم سمجھ گئے۔"

"ہاں! کیوں۔ اگر تم اتنی معلومات رکھتے ہو تو ہم بھی تو اندازہ لگا سکتے ہیں۔" محمود نے بُرا سا منہ بنایا۔

"اور انشارجہ کے صدر نے تمہارے صدر سے بھلا کیا کہا ہو گا؟"

"کوئی خوفناک خبر سنائی ہو گی اور کیا؟"

"ہاں! انھوں نے بتایا تھا کہ ملک پر ایک خوف ناک مصیبت نازل ہونے والی ہے۔ فوری طور پر اس کا بچاؤ کر لیں، اگر بچاؤ کے اقدامات فوری طور پر نہ کیے گئے تو پورا ملک تباہ ہو جائے گا۔ اور وہ خبر یہ تھی کہ ملک کے شمالی حصے میں اسلحے کا جو سب سے بڑا ذخیرہ ہے۔ اس

بس آگ لگانے کا انتظام کر لیا گیا ہے۔ یہ آگ صرف دو
گھنٹے بعد بھڑک اٹھے گی۔ اب غور کرو۔ اس اطلاع کے
بعد تم لوگوں کی باتوں کی کیا اہمیت رہ گئی ہو گی۔ تم لوگ
وہاں سے سیدھے یہاں آئے ہو۔ اس کالے بٹن کے بارے
میں ابھی تم کسی کو کچھ نہیں بتا سکے۔ لہٰذا ہم تم لوگوں کو بتانے
کی مہلت بھی نہیں دیں گے۔"

"یعنی تم خود بتاؤ گے۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"نہیں۔ تم لوگ یہیں تجربہ گاہ میں جل کر راکھ ہو
جاؤ گے۔"

"اور ہمارے ساتھ تم لوگ بھی؟" محمود نے حیران ہو
کر پوچھا۔

"نہیں۔ اس کا انتظام کر لیا گیا ہے۔ سامنے دیکھو۔"

انھوں نے سامنے دیکھا۔ پٹرول کی ایک موٹی تہ بہتی ان
کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ساتھ ہی ان دس مسلح آدمیوں نے
باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ بھی ان کے پیچھے دوڑے۔
لیکن انھوں نے پیچھے مڑ کر فائر جھونک مارے۔ وہ فرش پر
لیٹ گئے اور اسی طرح لڑھکتے چلے گئے، لیکن حملہ آور ان
سے پہلے نکل کر دروازہ بند کر چکے تھے۔

"بے وقوف۔ ہوا کے بغیر پٹرول بھلا آگ کس طرح پکڑ

سکتا ہے۔" فاروق مسکرایا۔

"انھوں نے آگ دکھانے کا بھی کوئی انتظام کر رکھا ہو گا۔
جلدی کرو۔ ہمیں کسی نہ کسی طرح سے نکلنا ہے۔"

"نکلنے کی بجائے۔ اگر ہم انھیں آگ نہ لگانے دیں۔" فرزانہ
نے کہا۔

"وہ اب اوپر سے جلتی ہوئی کوئی چیز اندر پھینکیں گے۔" محمود
نے فوراً کہا۔

عین اس وقت ایک شعلہ اوپر سے نیچے آتا نظر آیا۔ محمود
نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور اس شعلے کو گیند کی طرح کیچ
کرتے ہوئے دوسری طرف پھینک دیا۔ اس طرف ابھی پٹرول
نہیں پہنچا تھا۔ فاروق نے دوڑ کر اس شعلے کو بجھا دیا۔ یہ مشعل نما
کوئی چیز تھی۔ جونہی اس پر پاؤں رکھا، وہ بجھ گیا، لیکن پاؤں
اٹھاتے ہی شعلہ پھر بھڑک اٹھا:

"فرزانہ پانی۔"

"کیا کہا۔ میں پانی۔"

"ارے ارے۔ اوپر بھی نظر رکھو۔ جب وہ دیکھیں گے کہ
آگ نہیں بھڑکی۔ تو دوسرا شعلہ پھینکیں گے۔"

"اوہ ہاں۔"

فرزانہ نے پانی سے اس شعلے کو بجھا دیا اور پھر تینوں

اُوپر دیکھنے لگے۔ پانچ منٹ بعد دوسرا شعلہ آتا نظر آیا۔
تینوں اُچھلے اور فاروق نے شعلے کو کیچ کرتے ہی دوسری طرف
پھینک دیا۔ اس کو بھی پھینک دیا گیا۔ اور پھر پانی ڈال دیا گیا۔
"بہت خوب! یہ ہوئی نا بات!"
"لیکن کب تک۔ باہر سے شعلے آتے رہیں گے اور اگر
کوئی پٹرول پر گر گیا تو ہمارے شامی کباب تیار ہو جائیں
گے۔ لہٰذا جلد کچھ کرنا چاہیے۔"
"اچھا۔ میں چھت پر جا رہا ہوں۔ تم یہاں رہ کر شعلوں
پر نظر رکھو۔" محمود نے کہا اور چھت کی طرف دوڑ پڑا۔ اب
اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ تجربہ گاہ میں جدید اسلحہ
مناسب مقدار میں موجود تھا۔ چھت پر جا کر اس نے باہر
کا جائزہ لیا۔ دشمن باہر موجود تھا۔ اور شاید اس بات
سے بے نیاز تھا کہ یہ لوگ چھت سے حملہ کر سکتے ہیں۔ اس
نے نشانہ لیتے ہی مسلسل فائر جھونک مارے۔ ان کی چیخیں
فضا میں بلند ہوئیں اور زمین پر گر کر تڑپنے لگے۔ باقی جو لوٹ
لگا گئے۔ درختوں کے پیچھے ہو گئے۔ پروفیسر کی تجربہ گاہ
گھنے درختوں میں گھری ہوئی تھی۔ پروفیسر تجربہ گاہ کی
حفاظت کے لیے پولیس کا انتظام پسند نہیں کرتے تھے۔
ان کے خیال میں پولیس حفاظت کی بجائے۔ کام خراب کر

دیتی تھی۔ اس لیے انھوں نے تجربہ گاہ کی حفاظت کے
جدید انتظامات کر رکھے تھے، لیکن اس بار دشمنوں نے جدید
انداز میں وار کرنے کی بجائے۔ بہت پرانے طریقے سے
وار کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔۔ یعنی پٹرول کے ذریعے
آگ لگانے کا۔
اب ان کی طرف سے بھی جوابی فائرنگ ہوئی۔ لیکن
محمود ان کے مقابلے میں زیادہ محفوظ تھا۔ ادھر فاروق نے
دفتر فون کر کے حالات کی اطلاع دے دی۔ نتیجہ یہ کہ
مدد آ گئی اور حملہ آوروں کو گرفتار کر کے ان کے سامنے
پیش کیا گیا:
"ہاں بھئی۔ اب بتاؤ۔ جس چیز کے پیچھے تم پڑے ہو۔
اس چیز کا راز کیا ہے۔ کون تم لوگوں کے ذریعے وہ چیز
حاصل کرنا چاہتا ہے؟"
"راجا سیام۔" ان میں سے ایک نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
"راجا سیام۔ یہ نام شاید ہم پہلی بار سن رہے ہیں۔"
"اب سُن لیا ہے تو سنتے ہی رہو گے۔ راجا سیام تم سب
لوگوں کو سیدھا کر دے گا۔" ایک اور نے کہا۔
"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ سیدھا ہونا کون پسند نہیں
کرتا۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"یار سمجھا کرو۔ وہ دوسرے معنوں میں بات کر رہا ہے۔" محمود جھلا اُٹھا۔

"اب مجھے کیا معلوم کہ لوگ اب دوسرے اور تیسرے معنوں میں بھی باتیں کرنے لگ گئے ہیں۔ ہمارے زمانے میں تو صرف پہلے معنوں میں بات ہوتی تھی۔" فاروق نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"کیا مطلب۔ ہمارے زمانے میں۔ تو کیا تم اس دُنیا سے رُخصت ہو چکے ہو اور عالمِ بالا سے بات کر رہے ہو؟" فرزانہ گھبرا گئی۔

"اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے بھلا۔" فاروق نے مسکرا کر کہا۔

"وقت نہ ضائع کرو۔ فوری طور پر اپنے والد تک پہنچنے کی کوشش کرو۔ اور انھیں تلاش کرنے کا کام تم فون کے ذریعے کر ڈالو۔ اس سیاہ بٹن کے بارے میں اب ذمّے دار لوگوں کو خبر ہو ہی جانی چاہیے۔ ایسا نہ ہو۔ دشمن ہم پر کوئی اور بڑا حملہ کرے اور سب کو بھسم کر ڈالے۔"

"اللہ مالک ہے۔" محمود نے کہا اور فون پر جھک گیا۔ اس نے ہر طرف فون کر ڈالے، لیکن انھیں تلاش نہ کر سکا۔

"میں نے ہر جگہ پیغام دے دیے ہیں۔ اب جلد ان کا

فون آئے گا۔" یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

"چلو ٹھیک ہے۔ باہر اب چاروں طرف فورس موجود ہے، ہمیں فکر کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیا خیال ہے فرزانہ؟" فاروق نے اس کی طرف دیکھا۔

"میرے خیال میں تو فکر کی ضرورت ہے۔" فرزانہ نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"اچھا تو پھر کر لیتے ہیں فکر۔ ہمارا کیا جاتا ہے، یوں بھی فکر کرنے سے صحت اچھی رہتی ہے۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"کیا کہہ رہے ہو۔ ہم تو سُنتے چلے آ رہے ہیں کہ فکر کرنے سے صحت کا بیڑہ غرق ہو جاتا ہے۔"

"بھئی۔ فکر کی کئی قسمیں ہیں۔ سمجھا کرو۔" فاروق نے جھلا کر کہا۔

"لیجیے انکل! اب فکر کی قسموں پر لیکچر سُن لیں۔"

"اوہ ہاں! یہ بہت ضروری ہے۔" پروفیسر داؤد بے خیالی کے عالم میں بولے۔

"جی۔ کیا بہت ضروری ہے۔" فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

"وہی۔ جو تم کہہ رہی تھیں۔" انھوں نے گڑبڑا کر کہا۔

"ابا جان سے ملاقات ہونے سے پہلے ہی آپ ہمیں اس

"چیز کے بارے میں کیوں نہیں بتا دیتے۔" محمود نے بے تابانہ انداز میں کہا۔

"اوہ ہاں — واقعی — لو سنو۔"

عین اس وقت فون کی گھنٹی بج اٹھی — وہ زور سے چونکے۔

غدار

"سنگین الزام — کیا مطلب؟" رازی خان وکیل زور سے چونکا۔

"ہاں جناب! بہت زیادہ سنگین الزام — آپ کو پہلے ہی اس لیے بتا دینا چاہتا ہوں کہ غلط فہمی میں نہ رہیں اور اپنی مؤکلہ کو بچانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں — ویسے کیا آپ کو ایڑی چوٹی کا زور لگانا آتا ہے؟" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"میں مذاق پسند نہیں کرتا۔" اس نے بھنا کر کہا۔

"خیر الزام سن لیں آپ کی مؤکلہ میرے ملک سے غداری کرتی رہی ہیں۔"

"غداری؟" رازی خان اُچھلا۔

"ہاں! ملک سے غداری — میں اس بات کا ثبوت عدالت میں پیش کروں گا — یہاں ہرگز نہیں۔" ان کے لہجے میں بلا کی سختی آ گئی۔

"اگر یہ بات ثابت ہو گئی تو میں ان کی وکالت نہیں

کروں گا ۔ میں جرائم پیشہ افراد کی وکالت تو کر سکتا ہوں ۔ ملک
کے غداروں کی نہیں۔" وکیل نے کہا ۔

"یہ تو آپ کی بالکل غلط بات ہے۔" انسپکٹر جمشید نے
منہ بنایا ۔

"کیا مطلب ۔ کون سی بات؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"جرائم پیشہ افراد بھی ملک کے دشمن ہی ہوتے ہیں ۔ آخر کار
وہ ملک کو ہی نقصان پہنچاتے ہیں۔"

"خیر! میں آپ کی اس بات پر بھی غور کروں گا ۔ اب
میں اجازت چاہوں گا۔"

"مسٹر رازی خان ۔ انسپکٹر جمشید بالکل غلط کہہ رہے ہیں ۔
میں غیر ملکی جاسوس نہیں ہوں۔"

"آپ فکر نہ کریں ۔ میں آپ کی وکالت کا پورا پورا حق ادا
کروں گا۔"

وکیل کے جانے کے بعد بیگم پاکیزہ کو خصوصی حوالات پہنچایا
گیا اور پھر دونوں بیگم پاکیزہ کے ملازم خالد سرومی کے گھر
پہنچے ۔ دستک کے جواب میں ایک عورت نے دروازہ کھول اور
دروازے کی اوٹ سے پوچھا:

"کون؟"

"انسپکٹر جمشید۔"

"جی کیا مطلب؟" چونک کر کہا گیا۔

"ہمیں خالد سرومی سے ملنا ہے۔"

"تت ۔ تو کیا ۔ وہ آپ تک نہیں پہنچے؟"

"کیا مطلب ۔ کیا وہ میری تلاش میں نکلے ہیں۔"

"یہ تو بہت دیر پہلے کی بات ہے۔" اب اس کی آواز سے
پریشانی جھانکنے لگی ۔

"تب وہ بچوں سے مل چکے ہوں گے ۔ ایک منٹ ۔ میں
فون کر کے معلوم کر لوں۔"

یہ کہہ کر وہ گاڑی میں آئے ۔ گھر فون کیا ۔ بیگم کی رپورٹ
سن کر انھوں نے دفتر فون کیا ۔ وہاں سے لاش ملنے کی خبر
سنی ، پھر پروفیسر داؤد کو فون کیا اور پوچھا کہ محمود ، فاروق
اور فرزانہ ادھر تو نہیں آئے ۔ ان کی طرف سے جواب نفی میں
سن کر انھوں نے ان سے کہا کہ وہ یہاں آئیں گے ضرور اور
پھر ریسیور رکھ کر دروازے پر آئے ۔ خود پر قابو رکھتے ہوئے
انھوں نے کہا:

"محترمہ! ہمیں آپ سے یا آپ کے گھر میں اگر کوئی
مرد موجود ہے تو اس سے بہت سی باتیں پوچھنا ہیں ۔ اس لیے ۔۔"
انھوں نے جملہ درمیان میں چھوڑ دیا ۔

"یہاں میرے اور ان کے علاوہ کوئی نہیں رہتا۔"

انسپکٹر جمشید اور دکھ محسوس کرنے لگے۔ انھوں نے مشکل
سے کہا:

"اس صورت میں آپ ہمیں ڈرائنگ روم میں بیٹھنے دیں،
آپ دروازے کے باہر بیٹھ کر ہماری باتوں کے جوابات
دے سکتی ہیں۔"

"معاملہ کیا ہے۔ یہاں سے رخصت ہوتے وقت وہ بہت
پریشان تھے۔"

"معاملہ عجیب وغریب سا ہے۔"

"اچھا۔ میں دروازہ کھولتی ہوں۔"

سڑک کی طرف والے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھل گیا اور وہ اندر
داخل ہو گئے۔ اندرونی دروازے سے خالد کی بیوی نے کہا:

"فرمایئے! آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"آپ کے خاوند کہاں کام کرتے ہیں؟"

"ایک بہت دولت مند عورت کے گھر میں ملازم ہیں۔" اس
نے بتایا۔

"اس عورت کا نام؟"

"بیگم پاکیزہ۔"

"وہ وہاں کتنے عرصے سے کام کرتے ہیں؟"

"ایک زمانہ بیت گیا، لیکن اب وہ اس ملازمت سے

بہت بے زار ہو چکے ہیں۔ بیگم پاکیزہ کے بارے میں انھیں
کچھ ایسی باتیں معلوم ہوئی ہیں کہ وہ بہت پریشان ہو گئے
ہیں۔ بہت دیر پہلے انتہائی پریشانی کے عالم میں یہاں آئے
تھے۔ اور مجھے صرف اتنا بتایا تھا کہ آپ سے ملنے کے لیے
جا رہا ہوں۔"

"افسوس! وہ مجھ تک نہیں پہنچ سکے۔" انسپکٹر جمشید نے دکھ بھرے
لہجے میں کہا۔

"اللہ رحم کرے۔ آخر وہ کہاں ہیں؟"

"انھوں نے بیگم پاکیزہ کے بارے میں آپ کو کچھ بتایا؟"

"نہیں۔ کچھ نہیں۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں۔ کچھ دنوں
سے وہ زیادہ پریشان رہنے لگے تھے۔ اور رات کے وقت
روزانہ کسی سے ملنے کے لیے بھی جاتے تھے۔"

"آپ کا مطلب ہے۔ بیگم پاکیزہ کے گھر سے آنے کے
بعد؟" انھوں نے پوچھا۔

"ہاں! کھانا وانا کھانے کے بعد جاتے تھے اور قریباً
دو گھنٹے بعد آتے تھے۔ میں نے ان کی پریشانی کے بارے میں
بہت پوچھا، لیکن انھوں نے ہر بار صرف یہ کہا۔ بہت جلد
میں تمھیں سب کچھ بتا دوں گا۔" اس نے بتایا۔

"کیا آپ ہمیں گھر کی تلاشی لینے دیں گی؟"

"ضرور کیوں نہیں۔ وہ آپ کا اکثر ذکر کرتے ہیں۔ آپ سے بہت متاثر ہیں۔" بیوی نے بتایا۔

پھر وہ ایک طرف ہٹ گئی اور وہ دونوں گھر کی تلاشی لینے لگے۔ ایک الماری سے انھیں خالد سرومی کی ڈائری مل گئی:

"تو کیا مسٹر خالد ڈائری لکھنے کے عادی ہیں؟"

"یہ شوق انھیں کچھ دنوں سے لگا ہے۔"

"تو پھر۔ کیا آپ نے ان کی ڈائری پڑھنے کی کوشش نہیں کی؟" انھوں نے پوچھا۔

"ان کی اجازت کے بغیر کس طرح پڑھ سکتی ہوں۔ انھوں نے منع کر رکھا ہے۔"

"اوہ اچھا۔"

وہ بیٹھ کر ڈائری پڑھنے لگے۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔

آخر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور بولے:

"یہ ڈائری ہم لے جا رہے ہیں۔ مسٹر خالد کوئی اعتراض نہیں کریں گے۔ ہم بہت جلد آئیں گے۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"جی نہیں۔ اعتراض کیسا۔"

وہ باہر نکل کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔

"اکرام! یہ میرے لیے دُنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔ کسی کو یہ اطلاع دینا کہ اس کا عزیز اب اس دُنیا میں نہیں۔ یہ بے چاری اپنے خاوند کا انتظار کر رہی ہے، لیکن نہیں جانتی کہ اب اس کا خاوند کبھی نہیں آئے گا۔"

"ہاں سر۔ واقعی۔ یہ بہت مشکل کام ہے، لیکن ہمیں یہ کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"اور اس بار یہ کام تم کرو گے۔"

"جی۔ کیا فرمایا۔ میں کروں گا۔ نہیں۔ سر۔ یہ کام آپ مجھ سے بہت زیادہ بہتر طریقے سے کر لیتے ہیں۔"

"اکرام۔ تم میرا حکم ماننے سے انکار کر رہے ہو۔" ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

"سر۔ یہ بات نہیں۔"

"بات کچھ بھی نہیں۔ بس یہ اطلاع تم دو گے اسے۔" ان کے لہجے میں سختی آ گئی۔

"جو حکم سر۔" اکرام نے گھبرا کر کہا۔

ان کی گاڑی تیز رفتاری سے اڑی جا رہی تھی۔ آخر ایک چھوٹی سڑک پر مڑ گئی۔ انھیں تلاش کرنے میں چند منٹ لگے، پھر وہ ایک کوٹھی کے سامنے گاڑی سے اُترے۔ اکرام نے آگے بڑھ کر گھنٹی کا بٹن دبایا۔ جلد ہی ایک ملازم نے

دروازہ کھولا :

"جی فرمایئے؟" اس نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"ہمیں مسٹر حاتم غوری سے ملنا ہے۔"

"وہ بیمار ہیں۔"

"کیا وہ کسی سے بات چیت کرنے کے قابل بھی نہیں ہیں؟" انسپکٹر جمشید کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔"

"تو پھر وہ ہم سے ضرور ملاقات کریں گے - میرا کارڈ ان تک پہنچا دیں - شکریہ۔" انھوں نے کہا اور کارڈ نکال کر دے دیا۔

دو منٹ بعد مُلازم واپس آیا تو اس کے چہرے پر حیرت تھی :

"خیر تو ہے - بہت حیران نظر آ رہے ہیں؟"

"بات ہے بھی حیرت کی جناب - وہ ان دنوں کسی سے نہیں مل رہے ، لیکن آپ کا کارڈ دیکھتے ہی خوش ہو گئے۔"

"یہ ہماری خوش قسمتی ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"آیئے - وہ ڈرائنگ روم میں نہیں آ سکیں گے - ان کے کمرے میں ہی جانا ہوگا۔"

"بہت بہتر!"

وہ اس کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوئے، انھیں یُوں لگا جیسے سارا کمرہ ہی بیمار ہو - کمرے کے درمیان میں ایک مسہری بچھی تھی - اس پر ایک دُبلا پتلا آدمی لیٹا تھا - وہ برسوں کا بیمار نظر آ رہا تھا - اس نے ایک ہلکی سی مُسکراہٹ سے ان کا استقبال کیا :

"آپ کو اپنے گھر میں دیکھ کر بہت حیرت ہو رہی ہے۔"

"جب کہ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے -

"میرے لیے ہے جناب - میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ کسی روز اچانک میرے گھر آ جائیں گے - کاش میں اس وقت تندرست ہوتا۔"

"آپ کو ہوا کیا ہے؟"

"کسی کی سمجھ میں نہیں آتا - یہاں تک کہ ڈاکٹر صاحب کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا میرا مرض۔"

"تو آپ کسی اور ڈاکٹر سے چیک کرا لیں۔"

"پتا نہیں، کتنے ڈاکٹروں سے چیک کرا چکا ہوں - اب تھک ہار کر اپنے فیملی ڈاکٹر پر ہی تکیہ کیے بیٹھا ہوں۔"

عین اس وقت دروازے کی گھنٹی بجی -

"بھائی میاں غفور - دیکھنا کون ہے؟" حاتم غوری نے ہانک

لگائی۔

"اچھا صاحب": باہر کہیں سے آواز آئی۔

جلد ہی مُلازم ایک شخص کو ساتھ لیے اندر داخل ہوا۔ شکل صورت، لباس اور بیگ وغیرہ سے وہ ڈاکٹر دکھائی دیتا تھا:

"آئیے ڈاکٹر صاحب۔ آئیے۔ یہ میرے فیملی ڈاکٹر ہیں۔ ابھی میں ان کا ہی ذکر کر رہا تھا۔ نام ہے ڈاکٹر رضا خان۔ اور ڈاکٹر صاحب۔ ان سے ملیے۔ یہ ہیں انسپکٹر جمشید اور یہ ہیں ان کے اسسٹنٹ اکرام۔"

"اوہو اچھا": اس کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا۔

"ہاں! آپ کو بھی انھیں یہاں دیکھ کر حیرت ہوئی ہے نا؟"

"جی نہیں تو۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ شاید میں غلط وقت پر آگیا۔ میں کچھ دیر بعد آ جاؤں گا۔ یا ساتھ والے کمرے میں بیٹھ کر انتظار کر لیتا ہوں": ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

"نہیں۔ پہلے آپ فارغ ہو لیں۔ ہمیں دیر لگ جائے شاید": انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"اچھی بات ہے۔"

ڈاکٹر نے اسے چیک کیا، پھر دوائیں وغیرہ چیک کیں، آخر میں بولا:

"یہ کیپسول تو جوں کے توں پڑے ہیں۔ آپ نے ان میں

ایک بھی نہیں کھایا۔"

ہاں شاید۔ میں بھول گیا۔ اب کھاؤں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"میں اپنے ہاتھ سے کھلاتا ہوں": یہ کہہ کر ڈاکٹر نے کیپسولوں کی شیشی کھولی اور اس میں سے ایک کیپسول نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"اس وقت میں متلی سی محسوس کر رہا ہوں۔ کہیں قے نہ ہو جائے اور یہ قے میں نکل نہ جائے۔ میں کچھ دیر بعد کھا لوں گا۔"

"نہیں۔ یہ تو آپ میرے سامنے کھا ہی لیں، پھر تو آپ کو کل ہی کھانا پڑے گا۔ ایک روز جو کھانا ہے۔"

"میں کھا لوں گا، آپ مطمئن رہیں۔"

"اچھا خیر۔ میں چلتا ہوں۔ آپ پہلے سے بہت بہتر محسوس کر رہے ہیں۔"

"لیکن ڈاکٹر! میں خود کو بہتر کیوں محسوس نہیں کر رہا؟"

"ہوتا ہے بھئی۔ ایسا بھی ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر نے اپنا بیگ اٹھایا اور باہر نکل گیا۔ اس نے جاتے وقت ان سے علیک سلیک بھی نہیں لی۔

"یہ ڈاکٹر صاحب آپ کے کب سے فیملی ڈاکٹر ہیں جناب؟"

ایسے میں اکرام نے پوچھا۔
"ایک آدھ سال سے۔"
"آپ کو تکلیف کیا ہے۔ میرا مطلب ہے۔ تکلیف کا کو
نام نہیں ہوگا۔ کیفیت تو بتا ہی سکتے ہیں۔"
"سانس میں تکلیف محسوس کرتا ہوں۔ ہر سانس میرے لیے
میں پھانس کی طرح چبھتا ہے۔"
"یہ تو کافی تکلیف دہ مرض ہوا پھر۔"
"کافی نہیں۔ بہت زیادہ جناب۔" اس نے کہا۔
"اگر آپ پسند کریں تو میں اپنے ڈاکٹر سے آپ کو چیک کرا
دوں۔ بہت ہی اچھے ڈاکٹر ہیں۔"
"ضرور ایسا کریں، کیونکہ ان کے علاج سے میں کوئی فرق
نہیں محسوس کر رہا۔"
"ابھی لیجیے۔" وہ فون کی طرف بڑھے۔
"لیکن آپ پہلے وہ بات تو کر لیں، جس کے لیے آپ
آئے ہیں۔"
"وہ بھی ہو جائے گی۔"
انھوں نے فون کیا اور پھر اس کی طرف مڑے:
"آپ خالد سروی کو جانتے ہیں؟"
"اوہ! ہاں کیوں۔ کیا ہوا اسے؟"

"ان کا آپ سے۔ یا آپ کا ان سے کیا تعلق ہے؟"
"وہ میرا دوست ہے۔" اس نے کہا۔
"دوست۔ کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید کے لہجے میں حیرت
آئی۔
"کیوں، کیا آپ کے خیال میں میں اس کا دوست نہیں
سکتا؟"
"ہو سکتے ہیں۔ ضرور ہو سکتے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے۔
کسی گھر میں ملازم کے طور پر کام ہیں؟" انھوں نے کہا۔
"ہاں! بیگم پاکیزہ کے۔ تو پھر اس میں عجیب بات کیا ہے؟"
"آپ اتنے دولت مند ہیں اور آپ کے دوست ایک گھر میں
زم ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے اسے گھورا۔
"کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ایک امیر آدمی کا ایک
ب آدمی دوست نہیں ہو سکتا۔"
"ضرور ہو سکتا ہے۔ میں یہ نہیں کہنا چاہتا۔ میرا تو
لب یہ ہے کہ کیا آپ اپنے دوست کو کام کرنے کے
رقم نہیں دے سکتے تھے۔"
"ہاں! آپ کی یہ بات ٹھیک ہے۔ خیر اب سنیں۔ میرا
دوست دراصل ایک پرائیویٹ جاسوس ہے۔ اور میرے ہی
نے پر بیگم پاکیزہ کے گھر اس نے ملازمت کی ہے، لیکن

آپ کو ان سب باتوں کا پتا کیسے چلا؟"

"اب تک آپ کے دوست خالد سرومی نے کیا معلو
حاصل کی ہیں؟"

"یہ کہ بیگم پاکیزہ بہت خطرناک عورت ہے۔ ایک غ
راجا سیام کو اپنے اشاروں پر نچاتی ہے، اس کے تمام
بیگم پاکیزہ کے کام کرتے ہیں۔"

"ہوں! بیگم پاکیزہ کے بارے میں انھوں نے اور کیا
کیا ہے؟"

"اس نے بتایا تھا کہ معلومات تو اس نے بہت حاصل
لی ہیں، لیکن وہ ابھی مجھے نہیں بتائے گا۔"

"ہوں! کسی کالے رنگ کے بٹن نما آلے کے بارے
تو کوئی بات نہیں کہی اس نے؟"

"نہیں جناب۔ کیوں، یہ کیوں پوچھا آپ نے؟"

"آپ کا دوست آپ کے تجربے پر قربان ہو چکا
انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"کیا کہا؟" حاتم غوری چلا اٹھا۔

"ہاں! انھوں نے کوئی بہت خاص بات معلوم کر لی
اس لیے انھیں ختم کر دیا گیا۔ میں اس وقت جب وہ
فون کرنا چاہتے تھے۔"

"اُف مالک! یہ میں کیا سن رہا ہوں۔" اس نے روتے
ہوئے کہا۔

"ایک بہت اہم بات آپ نے نہیں بتائی۔"

"جی۔ وہ کیا؟"

"آپ کو بیگم پاکیزہ پر کیا شک تھا۔ آخر آپ نے اپنے
دوست کو اس کے پیچھے کیوں لگایا تھا؟"

"اس کے خاوند سے میری علیک سلیک تھی۔ اس علیک سلیک
کے دوران کئی بار مجھے احساس ہوا کہ وہ کوئی غلط کام کرتا ہے،
اس بات کا ذکر میں نے اپنے دوست خالد سرومی سے کیا۔
اس نے کہا کہ یہ تو پھر ایک لمبا کام ہو گا۔ ایسا کرتے ہیں،
میں بطور ملازم اس گھر میں چلا جاتا ہوں۔ یہ تجویز مجھے پسند
آئی۔ ہم نے اس کے ایک ملازم کو توڑا، اسے زیادہ تنخواہ کا
لالچ دے کر اپنے پاس بلا لیا اور خالد سرومی وہاں ملازمت
کی درخواست لے کر پہنچ گیا۔ ادھر میں نے اس کی سفارش
کر دی؛ چنانچہ اسے رکھ لیا گیا اور اس طرح ہمارا کام شروع
ہو گیا۔"

"ہوں! اور وہ ملازم۔ جس کو وہاں سے نکالا گیا؟" انسپکٹر
جمشید بولے۔

"وہ اس وقت میرے گھر میں ہے۔"

"اُسے بُلائیں۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

جلد ہی کمرے میں ایک مُلازم داخل ہوا:

"آپ پہلے بیگم پاکیزہ کے ہاں مُلازم تھے؟"

"ہاں جناب۔"

"وہاں آپ کو کتنی تنخواہ ملتی تھی؟"

"ایک ہزار روپے۔"

"مسٹر حاتم غوری کتنی تنخواہ پر آپ کو لے کر آئے؟"

"دو ہزار روپے پر۔"

"جب مسٹر حاتم غوری نے آپ کو دو ہزار روپے کی پیش کش کی تو پھر آپ بیگم پاکیزہ کے پاس گئے تھے؟"

"جی۔ کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ جا کر بیگم پاکیزہ کو بتایا تھا کہ مجھے فلاں جگہ سے دو ہزار مل رہے ہیں۔ اور اگر وہ اس سے زیادہ دینا چاہیں تو بات کر لیں۔"

"ہاں! یہ سچ ہے۔ میں یہ بات بیگم پاکیزہ کو بتانے گیا تھا۔"

"تو پھر انھوں نے کیا کہا؟"

"یہ کہ انھیں ضرورت نہیں ہے۔"

"جھوٹ نہ بولیں بھئی۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"جی۔ کیا مطلب؟" وہ اور زور سے چونکا۔

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔" انسپکٹر جمشید کا لہجہ عجیب ہوگیا۔

"میں سمجھا نہیں۔" اس نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"اچھی بات ہے، میں سمجھاتا ہوں آپ کو۔ جب اِن کی طرف۔ میرا مطلب ہے۔ مسٹر حاتم غوری کی طرف سے اطلاع ملی کہ یہ آپ کو دو ہزار روپے ماہوار پر ملازم رکھنا چاہتے تو آپ بیگم پاکیزہ کے پاس گئے اور انھیں بتایا کہ آپ ملازمت چھوڑنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے وجہ پوچھی تو آپ نے بتایا کہ آپ کو دو ہزار روپے کی ملازمت مل رہی ہے۔ آج کل گھریلو ملازم کو کوئی دو ہزار روپے ماہوار نہیں دیتا۔ یہ بات بیگم پاکیزہ کو عجیب لگی، انھوں نے آپ سے پوچھا کہ آخر وہ کون ہے جو آپ کو دو ہزار روپے ماہوار دے رہا ہے؟ آپ نے حاتم غوری صاحب کا نام بتا دیا۔ مسٹر حاتم غوری کا نام سُن کر وہ حیران ہوئی ہوں گی اور پھر انھوں نے آپ سے ایک سودا کیا۔" یہاں تک کہہ کر وہ خاموش ہوگئے۔

"سودا۔ کیسا سودا؟" حاتم غوری دھک سے رہ گئے۔

"ہاں جناب سودا۔ انھوں نے اپنے اس ملازم کو اجازت دے دی کہ مسٹر حاتم غوری کے ہاں جا کر ملازمت کر سکتا ہے، لیکن انھوں نے ایک پیش کش بھی کی، اور وہ یہ کہ

اسے وہ تنخواہ بدستور دیتی رہیں گی ، شرط یہ ہے کہ
یہ اس گھر میں ہونے والی کارروائیوں کی رپورٹ بیگم
صاحبہ کو دیتے رہا کریں۔ خاص طور پر صرف ان باتوں
کی رپورٹ جو بیگم پاکیزہ کے بارے میں ہوں ؛ چنانچہ
آپ تیار ہو گئے۔ اب آپ اِدھر سے بھی تنخواہ لیتے
رہے ہیں اور اُدھر سے بھی۔ اور بیگم پاکیزہ کے لیے جاسوسی
بھی کرتے رہے ہیں ، میں غلط تو نہیں کہ رہا ؟"
ملازم کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔
"جواب دو بھئی"۔
"آخر آپ نے یہ باتیں کس طرح معلوم کر لیں"۔ اس
نے بوکھلا کر کہا۔
"آپ کے دوست خالد سرمدی کا قتل اسی طرف اشارہ کرتا
ہے۔ آپ کی کہانی سن کر جب ساری کڑیاں ملائی جائیں تو
یہ نتیجہ خود بخود سامنے آ جاتا ہے۔ ان صاحب نے درمیانی
کڑی کا کام کیا ہے۔ آپ سے غلطی یہ ہوئی کہ اسے وہاں
سے توڑتے وقت اپنا نام نہیں چھپایا۔ اس وقت ان حضرت
کو معلوم نہیں تھا کہ آپ کا کیا پروگرام ہے۔ نہ انھیں
بیگم پاکیزہ کے ارادوں کا علم تھا۔ ورنہ شاید یہ ایک ہزار
روپے میں ؛ کام کرنے سے صاف انکار کر دیتے"۔ انسپکٹر

جمشید نے کہا۔
"کیوں بھئی۔ جواب دو"۔ حاتم غوری نے جھلا کر کہا۔
"انسپکٹر جمشید صاحب بالکل درست کہ رہے ہیں"۔
"اُف مالک۔ یہ میں نے کیا کیا۔ میری غلط منصوبہ بندی
کی وجہ سے میرا دوست مارا گیا"۔
"اس میں آپ کا قصور نہیں"۔
"اب میں اس غدار کا کیا کروں ؟"
"یہ فی الحال حوالات میں رہیں گے۔ انھیں بھی تھوڑی
بہت سزا تو ملے گی۔ ہم نہیں کہ سکتے کہ اگر انھیں معلوم
ہوتا کہ بیگم پاکیزہ ملک دشمن ہیں تو پھر بھی یہ اس کے لیے
کام کرتے یا نہیں۔ اگر یہ بات ثابت ہو جائے تو پھر
انھیں بھی سزا ملتی ، لیکن ان حالات میں ہم زیادہ سے
زیادہ یہ کہ سکتے ہیں کہ انھیں نہیں معلوم تھا۔ بیگم پاکیزہ
کون ہیں ، کیا کرتی ہیں۔ یہ تو بس لالچ میں آ گئے"۔
"بات ہے بھی یہی سر"۔ اس نے گھبرا کر کہا۔
"اچھا خیر۔ دیکھا جائے گا"۔
عین اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی :
"شاید ڈاکٹر صاحب آ گئے"۔
"میں خود دیکھتا ہوں جا کر"۔ حاتم غوری نے جلدی سے

اُٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں - آپ یہیں ٹھہریں - میں انھیں اندر لے آتا ہوں"۔ یہ کہ کر وہ باہر نکل گئے - انھوں نے اکرام کو بھی بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

جلد ہی وہ اندر داخل ہوئے - ان کے ساتھ ڈاکٹر فاضل تھے - اچانک ڈاکٹر فاضل کے چہرے پر خوف دوڑ گیا۔

رُل گئے

پروفیسر داؤد نے فون کا ریسیور اٹھایا ہی تھا کہ دُوسری طرف سے ایک خوفناک آواز سنائی دی:

"پروفیسر! زندگی چاہتے ہو تو اس چیز کے بارے میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو"۔

"کون ہو تم"؟ انھوں نے جھلّا کر کہا۔

"پوری تجربہ گاہ بھک سے اڑ جائے گی - ادھر تم نے زبان کھولی - ادھر تجربہ گاہ اڑی"۔

"یہ کیا بکواس ہے"؟

اسے بکواس نہیں، اطلاع کہتے ہیں - اگر یقین نہیں تو اپنی تجربہ گاہ کے نظام کو چیک کر لو - اگر تمہارا حفاظتی نظام بے کار نہیں ہو چکا تو میں غلط کہ رہا ہوں اور اگر بے کار ہو چکا ہے تو میں درست ہوں - اس صورت میں تمھیں اپنی اور اپنی تجربہ گاہ کی فکر کرنی چاہیے - نہیں کرو گے

تو مٹ جاؤ گے۔ ہمارا کیا جاتا ہے، یُوں بھی اس تجربہ گاہ
کو مٹا کر اور تمھیں مٹا کر ہمیں خوشی ہی ہو گی۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی ریسیور رکھ دیا گیا، پروفیسر داؤد
کی پیشانی پسینے سے بھیگ چکی تھی:

"خیر تو ہے انکل! آپ تو یک لخت بہت پریشان ہو
گئے؟" محمود نے گھبرا کر کہا۔

"ہاں بھئی۔ بات ہی ایسی ہے۔ کیا تم مجھے چند منٹ دو
گے؟" انھوں نے کہا۔

"کیا آپ کہیں جانا چاہتے ہیں؟"

"نہیں! تجربہ گاہ میں ہی چند چیزیں چیک کرنا ہیں۔"

"ضرور کر لیں۔"

وہ اٹھ کر باہر نکل گئے۔ ان کی واپسی پندرہ منٹ بعد
ہوئی تو ان کا چہرہ دُودھ کی طرح سفید ہو چکا تھا۔

"یا اللہ رحم۔" فرزانہ گھبرا گئی۔

"تجربہ گاہ کے تمام حفاظتی انتظامات ناکارہ کر دیے گئے
ہیں۔ تجربہ گاہ کسی وقت بھی بھک سے اڑ سکتی ہے۔ غالباً
ریموٹ کنٹرول بم بھی نصب کیا جا چکا ہے اور یہاں ہونے
والی گفتگو کا ایک ایک لفظ کہیں سُنا جا رہا ہے۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے خوف زدہ انداز میں نکلا۔

"اور۔ وہ مجھے روکنا چاہتا ہے۔ جانتے ہو، کس چیز سے؟"

"جی۔ کس چیز سے؟"

"یہ کہ میں اس کالی چیز کے بارے میں تمھیں یا کسی کو
کچھ نہ بتاؤں۔"

"اور روکنے کے لیے آپ کو اس نے یہ دھمکی دی ہو
گی، تجربہ گاہ بھک سے اڑ جائے گی۔ میرا مطلب ہے۔
بتانے کی صورت میں۔"

"ہاں۔" انھوں نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"تب یہ بات بالکل دھوکا ہے۔" محمود نے گھبرا کر کہا۔

"کیا مطلب؟"

"اس صورت میں وہ آپ کو زندہ چھوڑ ہی نہیں سکتے۔ اور
اس کا مطلب یہ ہے کہ تجربہ گاہ میں ریموٹ کنٹرول بم نہیں،
ٹائم بم لگایا گیا ہے۔ اور اس میں ابھی کچھ وقت ہے۔
لہذا وہ نہیں چاہتے کہ آپ اس سے پہلے ہمیں کچھ بتائیں اور
ہم سُن کر تجربہ گاہ سے نکل جائیں۔ لہٰذا خیریت اسی میں
ہے کہ ہم فوری طور پر تجربہ گاہ کو خالی کر دیں۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے مارے خوف کے نکلا۔

اور پھر وہ سب باہر کی طرف دوڑے۔ ملٹری کے
جوان انھیں اس طرح دوڑتے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے،

ان کا آفیسر چلایا:

"کیا ہوا سر؟"

"دوڑیں۔ آپ لوگ بھی۔" پروفیسر چلائے۔

"آخر ہوا کیا ہے؟"

"تجربہ گاہ میں ٹائم بم رکھ دیا گیا ہے۔ ہم نہیں جانتے، وہ کس وقت پھٹے گا۔"

وہ سب تجربہ گاہ سے دُور ہوتے چلے گئے۔ اور پھر ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا۔ اگرچہ وہ تجربہ گاہ سے دُور نکل چکے تھے، لیکن اس کے باوجود وُہ منہ کے بل گرے۔ انھوں نے اٹھ کر دیکھا تو تجربہ گاہ ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکی تھی۔

"اُف مالک۔ اگر فرزانہ خیال نہ دلاتی تو اس وقت ہم بھی تجربہ گاہ کے ملبے کے نیچے دب چکے تھے۔"

عین اسی وقت گولیوں کی تڑا تڑ کی آواز سنائی دی۔ گولیاں ان پر چلائی گئی تھیں۔ کئی چیخیں بلند ہوئیں۔ چند فوجی زمین پر گرے اور باقیوں نے فوراً پوزیشن سنبھال لی۔ دو طرف سے فائرنگ شروع ہو گئی۔

"یہ لوگ ہر حال میں پروفیسر صاحب کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ انکل۔ موت اور زندگی کا کوئی پتا نہیں۔ آپ ہمیں اس کالی چیز

کے بارے میں بتا دیں۔" محمود نے بے چین ہو کر کہا۔

"ہاں ضرور۔ میں بھی اب رہ نہیں سکتا۔ زندگی کا واقعی کوئی بھروسا نہیں۔ کان ادھر لاؤ۔"

انھوں نے محمود کے کان میں بات بتا دی۔ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اب اس نے فاروق کے کان میں اور فاروق نے فرزانہ کے کان میں داغ دی۔ ان پر سکتے کا عالم طاری تھا اور ان کے سروں پر گولیاں برس رہی تھیں۔ انھوں نے بھی پستول نکال لیے۔ اور شروع ہو گئے۔ دشمن نے انھیں چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ وہ حیران ہو رہے تھے کہ اتنی بڑی تعداد میں دشمن آخر کہاں سے آ گئے، مارے حیرت کے ان کا بُرا حال تھا۔

اچانک دشمن بھاگ نکلا:

"ان میں سے چند ایک کو گرفتار کرنا بہت ضروری ہے۔" محمود نے بلند آواز میں کہا۔

فوجی ان کے تعاقب میں نکل گئے۔ انھوں نے دفتر فون کیا۔ اور حالات سنا دیے۔

"نہ جانے ابا جان اور انکل اکرام کہاں مصروف ہیں۔" فرزانہ نے بے چینی کے عالم میں کہا۔

"اس کا مطلب ہے۔ اس مرتبہ کیس کا سہرا صرف ہمارے

سر رہے گا۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"کیا خاک سہرا سر رہے گا۔ انکل کی تجربہ گاہ اڑ گئی۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"تم اس کی فکر نہ کرو۔ تجربہ گاہ پھر بن جائے گی۔" پروفیسر داؤد مسکرائے۔

جلد ہی فوجی واپس آتے نظر آئے۔ وہ چند آدمیوں کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ انھیں ان کے سامنے لا کھڑا کیا گیا۔

"کس کے لیے کام کر رہے ہو بھئی؟" محمود نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"چاہتے تو نہ بتاتے اور تم اگلوا نہیں سکتے۔" ان میں سے ایک نے بھنا کر کہا۔

"یہ تجربہ بھی کر لو۔ اگر کرنا چاہتے ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تم اپنا منہ بند کر لو۔ ہم کھلوا کر دکھائیں گے۔"

"اچھا! یہ بات ہے۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"ہاں! یہی بات ہے۔" فاروق بولا۔

"فاروق! اس طرح وقت ضائع ہوگا۔ اگر یہ بتانے کے لیے تیار ہیں تو ہمیں الجھنے کی کیا ضرورت ہے۔" فرزانہ نے پریشان

آواز میں کہا۔

"اوہ اچھا۔ اچھا بھئی۔ تم اپنی مرضی سے ہی بتا دو۔"

"اب تو نہیں بتائیں گے۔" وہ اڑ گیا۔

"اب تم کیا کہتی ہو فرزانہ؟"

"مجبوری ہے، انھیں امتحان گاہ لے جانا ہوگا۔"

اسی وقت ملٹری کی گاڑی میں انھیں امتحان گاہ لے جایا گیا۔ راستے میں حفاظت کے لیے ایک فوجی گاڑی آگے تھی اور دوسری پیچھے۔ امتحان گاہ میں انھیں پہلے شکنجوں میں کسا گیا۔ اور پھر ایک بٹن دبایا گیا۔ ان کی لگیں چیخیں نکلنے۔ آخر وہ چلائے:

"بند کرو۔ بند کرو۔ ہم بتانے کے لیے تیار ہیں۔"

"ہمیں پہلے ہی معلوم تھا۔ کہ تم بتا دو گے۔ چلو بتاؤ۔ کس کے لیے کام کر رہے ہو؟"

"پہلے اس شکنجے سے نکالیں۔"

"اچھا۔ یہ شرط بھی ہے۔ کھول دیں بھئی انھیں۔" محمود نے مسکرا کر کہا۔

کھلنے کے بعد بھی وہ کئی منٹ تک ہانپتے رہے، لیکن منہ سے کچھ نہ بولے۔

"آخر کب تک ہانپتے رہنے کا پروگرام ہے بھئی؟"

"ہم ہم راجا سیام کے لیے کام کر رہے ہیں۔"

"بہت خوب۔ راجا سیام کے بارے میں بھی سب کچھ بتا دو۔"

انھوں نے اس کے بارے میں جو کچھ جانتے تھے، بتا دیا۔ اس سلسلے میں ہوٹل نوری کا بھی نام آیا۔ انھوں نے ایک دُوسرے کی طرف دیکھا، پھر محمود نے کہا:

"کیا خیال ہے۔ ہوٹل نوری کو چیک کیا جائے؟"

"ہرگز نہیں۔ ہمارے سینوں میں ایک عدد امانت موجود ہے۔ پہلے اس امانت کو ابا جان تک پہنچانا ہے۔"

"میں بھی یہی کہنے والا تھا۔" فاروق مسکرایا۔

"خیر۔ یونہی سہی۔ اب سوال یہ ہے کہ ابا جان کو کہاں تلاش کیا جائے؟"

"کہیں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم انکل شیخ صاحب کو فون کر دیتے ہیں۔ وہ یہاں آ کر ہمیں دفتر لے جائیں گے، ابا جان وہیں آ جائیں گے۔"

"ان حالات میں اس سے زیادہ محفوظ پروگرام نہیں ہو سکتا۔"

"تو پھر کرو۔ فون۔" فرزانہ بولی۔

محمود نے دفتر فون کیا۔ آئی جی صاحب سے بات کی اور مختصر طور پر حالات سنا دیے، پھر اپنے پروگرام کے بارے میں بتایا:

"ٹھیک ہے۔ آپ لوگوں کو لینے کے لیے خاص گاڑیاں

بھیجی جا رہی ہیں۔ ان کی حفاظت کے انتظامات بھی زبردست ہوں گے۔"

"بہت بہت شکریہ انکل۔" محمود نے مُسکرا کر کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

"جانے کو ہم فوجیوں کے درمیان بیٹھ کر بھی جا سکتے تھے۔" فرزانہ نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔

"اب بھی یہ لوگ ہمارے ساتھ جائیں گے۔ ہمیں زبردست حفاظتی انتظامات کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔"

عین اس وقت فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ آئی جی صاحب کی آواز سے پریشانی جھانک رہی تھی:

"افسوس! میں آپ لوگوں کو دفتر نہیں بلا سکتا۔"

"جی کیا مطلب۔ کیا ہوا؟"

"ابھی ابھی وزیرِ اعظم صاحب نے ہنگامی حالات کا اعلان کیا ہے۔ تارجستان کی فوج نے ہماری سرحدوں پر اچانک جمع ہونا شروع کیا ہے اور اس کے ارادے بہت خطرناک لگتے ہیں۔ وزیرِ اعظم صاحب نے فوری طور پر ایک میٹنگ بُلائی ہے۔ اس میں مجھے بھی بُلایا گیا ہے۔ ان حالات میں آپ لوگ یہاں آ تو سکتے ہیں، لیکن میں نہیں ملوں گا۔ اب جو آپ مناسب سمجھیں۔"

"کیا انکل خان بھی آپ کے ساتھ جا رہے ہیں؟"

"ہاں!" انھوں نے کہا۔

"اچھی بات ہے۔ ہم دفتر کی بجائے یہاں سے اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ دفتر کے بعد گھر ہی ہمارے لیے محفوظ ترین جگہ ہے۔"

"ٹھیک ہے، لیکن جمشید کہاں ہے؟"

"وہ ہیں تو شہر میں ہی، لیکن کہاں ہیں، یہ معلوم نہیں۔"

"اچھا خیر۔ تم اپنی حفاظت اب خود کرنا۔ پتا نہیں، کیا ہونے والا ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ ہم ابھی جا کر غائب ہو جائیں گے۔" محمود نے کہا۔

اور پھر وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئے، ملٹری کی گاڑیاں اب بھی ان کے آگے پیچھے تھیں۔ وہ خود بھی پوری طرح چوکس بیٹھے تھے۔ اس طرح وہ گھر پہنچ گئے۔ بیگم جمشید نے جب ان کے لیے دروازہ کھولا تو فوجیوں کو دیکھ کر حیران رہ گئیں:

"خیر تو ہے۔ آج بہت فوجیوں کو ساتھ لیے پھر رہے ہو، اوہو، پروفیسر صاحب بھی ساتھ ہیں۔"

"ہاں بھابی۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔"

"تو پھر اندر آ جائیں۔ اطمینان سے بیٹھ کر کہانی سنی جانی چاہیے۔" وہ مسکرائیں۔

محمود نے ملٹری جوانوں کے آفیسر سے گھر کی حفاظت کے لیے بات کی اور اندر آ گیا۔ سب لوگ صحن میں آ کر بیٹھ گئے۔ عین اس وقت فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ محمود نے چونک کر ریسیور اٹھایا اور پھر اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس کے منہ سے نکلا:

"ہل گئے!"

مزے دار بات

"یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔" انھوں نے چلا کر کہا۔

"کیا دیکھ رہے ہیں؟"

"یہ۔ یہ صاحب۔ انھوں نے کیا کھایا ہے؟" انھوں نے حاتم غوری کی طرف اشارہ کیا۔

"مم۔ میں۔ نے۔ کچھ بھی نہیں کھایا۔ کیوں کیا بات ہے؟"

"جلدی سے مجھے نبض دکھائیں۔" انھوں نے گھبرا کر کہا اور آگے بڑھ کر حاتم غوری کی کلائی پکڑ لی۔ پھر انھوں نے نبض کو اس طرح چھوڑ دیا جیسے بچھو نے کاٹ کھایا ہو:

"اُف مالک۔" انھوں نے فوراً بیگ میں سے چند گولیاں نکال کر انھیں دیں:

"فوراً انھیں نگل لیں۔ اوپر سے پانی پی لیں۔ خوب پیٹ بھر کر پانی پینا ہے۔"

"آخر مجھے ہوا کیا ہے؟"

"ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔"

حاتم غوری نے پریشان ہو کر گولیاں نگل لیں، انسپکٹر جمشید اتنے میں پانی لے آئے تھے۔ انھوں نے پانی کا جگ ان کے منہ سے لگا دیا۔

"اوہو۔ میں اتنا پانی کس طرح پی سکتا ہوں؟"

"آپ کو پینا ہو گا۔ ورنہ آپ کی زندگی کو خطرہ ہے۔"

"کیا!!!" وہ چلائے اور غٹا غٹ پانی پی گئے۔

"اب آپ غسل خانے میں جا کر بیٹھ جائیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"کیوں! میں وہاں کیوں بیٹھوں۔"

"آپ کو ایک بہت بڑی قے ہونے والی ہے۔ مہربانی فرما کر قے پر پانی نہ بہائیے گا۔"

"اوہ!" وہ اٹھ کر غسل خانے کی طرف دوڑ گئے۔

"یہ سب کیا ہے ڈاکٹر صاحب؟"

"انھیں زہر دیا گیا ہے۔ ان کے چہرے پر دوڑنے والی نیلاہٹ کو آپ لوگ محسوس نہیں کر سکتے، لیکن ایک ڈاکٹر ایسی چیزوں کو فوراً بھانپ لیتا ہے۔ اگر میں چند منٹ اور نہ آتا تو پھر ان کا بچایا جانا قریباً ناممکن ہوتا۔"

"یا اللہ رحم۔"

مین اسی وقت قے ہونے کی آواز ان تک پہنچی۔ چند منٹ ،

بعد بڑی مشکل سے چلتے ہوئے حاتم غوری ان تک پہنچے:

"اُف مالک — میری تو ٹانگوں سے جان ہی نکل گئی۔"

"شکر کریں — آپ بچ گئے — انسپکٹر صاحب — اپنے کسی ماتحت کو بلا لیں — اس قے کا نمونہ لینا ہے۔" ڈاکٹر صاحب بولے۔

"اوہ ہاں!" انھوں نے کہا اور اکرام کو اشارہ کیا، پھر ان کی طرف مڑے:

"آپ نے آج ابھی تھوڑی دیر پہلے کیا کھایا ہے؟"

"ایک کیپسول۔"

"کیپسول — کیسا کیپسول؟"

"جو مجھے ڈاکٹر صاحب نے لکھ کر دیے ہیں۔"

"ڈاکٹر — کون سے ڈاکٹر؟"

"ڈاکٹر رضا خان نے — وہ میرا علاج کر رہے ہیں۔"

"مجھے دکھائیے وہ کیپسولوں کی شیشی۔"

انھوں نے شیشی دیکھی — کیپسول دیکھے — ان کے مرض کی تفصیلات پڑھیں، ان سے سوالات کیے اور آخر بولے:

"ان کیپسولوں میں تو کوئی ایسی بات نہیں — ضرور آپ نے کوئی اور چیز کھائی ہے۔"

"نہیں — گذشتہ ایک گھنٹے سے میں نے کچھ نہیں کھایا — صرف اس ایک کیپسول کے علاوہ۔"

"اور — اس شیشی میں سے کیپسول آپ روز ہی کھاتے رہے ہیں؟"

"ہاں! بالکل۔"

"تب زہر ان میں نہیں ہو سکتا۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"کیوں نہیں ہو سکتا ڈاکٹر صاحب۔" ایسے میں انسپکٹر جمشید نے عجیب سے انداز میں کہا۔

"اس لیے کہ اس شیشی میں سے تو یہ ایک کیپسول روزانہ کھاتے رہے ہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"حاتم غوری صاحب — آپ بتائیے — یہ شیشی آپ نے کہاں سے خریدی تھی؟"

"ڈاکٹر رضا خان نے خود لا کر دی تھی۔"

"کیا اس کی سیل لگی ہوئی تھی؟"

"پہلا کیپسول تو خود ڈاکٹر صاحب نے اپنے ہاتھ سے نکال کر دیا تھا — اب مجھے کیا معلوم کہ سیل لگی ہوئی تھی یا ٹوٹی ہوئی۔" انھوں نے بُرا سا منہ کر کہا۔

"اب آپ کے ڈاکٹر کو بھی بلانا پڑے گا — ان کا فون نمبر بتائیے۔"

ڈاکٹر رضا خان کو فون کیا گیا — پندرہ منٹ بعد وہ آ گئے — ان کا رنگ اڑا اڑا تھا:

"کیا بات ہے جناب - خیر تو ہے۔" انھوں نے پریشان ہو کر کہا۔

"آپ کے مریض کو زہر دیا گیا ہے - ان کا کہنا ہے کہ انھوں نے ایک گھنٹے سے سوائے ایک کیپسول کے اور کچھ نہیں کھایا - کیپسولوں کی یہ شیشی آپ نے انھیں دی تھی؟"

"جی ہاں! بالکل دی تھی - لیکن اس میں سے تو یہ ایک کیپسول روزانہ کھاتے رہے ہیں، اگر ان میں کوئی بات ہوتی تو پہلے روز گڑبڑ ہو جاتی۔"

"ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ یہ نہیں جانتے - جب شیشی یہاں لائی گئی، اس وقت سیل بند تھی یا نہیں - یہ کہتے ہیں کہ پہلا کیپسول آپ نے اپنے ہاتھ سے انھیں نکال کر دیا تھا۔"

"ہاں! یہ ٹھیک ہے، میں نے پہلا کیپسول انھیں شیشی میں سے نکال کر دیا تھا اور شیشی کی سیل میں نے نہیں توڑی تھی، مسٹر حاتم غوری کو یاد نہیں رہا ہوگا۔"

"ہو سکتا ہے یہی بات ہو - اب مشکل یہ ہے کہ انھوں نے ایک گھنٹے سے سوائے کیپسول کے کچھ نہیں کھایا - اور میں اس زہر کی علامت سے بہت اچھی طرح واقف ہوں - اس زہر کے کھانے کے پندرہ منٹ تک آدمی کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اس نے کوئی زہر کھایا ہے، لیکن اس کے چہرے پر

زہر کے آثار نظر آنے لگتے ہیں، یہی حالت تھوڑی دیر پہلے مسٹر حاتم کی تھی - میں جونہی یہاں داخل ہوا - میں نے چہرے کی علامت سے زہر کو بھانپ لیا اور انھیں قے کرا دی۔" ڈاکٹر فاضل جلدی جلدی کہتے چلے گئے۔

"لیکن اس کا مطلب بھی یہ نہیں بنتا کہ ان کیپسولوں میں زہر موجود ہے، کیونکہ یہ تو ایک روز کھا رہے ہیں۔"

"بہت خوب ڈاکٹر صاحب! میں آپ کو گرفتار کرتا ہوں۔"

انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ یہ جرم آپ نے کیا ہے - سیل آپ نے توڑی تھی - اور اس میں ایک زہریلا کیپسول شامل کیا تھا - کیونکہ یہاں ایک گھنٹے کے اندر حاتم غوری صاحب نے اس کیپسول کے سوا کچھ نہیں کھایا - اگر زہر اس میں نہیں تھا تو ان کے جسم میں کس طرح داخل ہو گیا - اور میرا خیال ہے - یہ زہر پوٹاشیم سائنائیڈ کی طرح اس قدر تیز نہیں ہوگا کہ سوئی کی ایک نوک پر رکھ کر جسم میں داخل کر دیا جاتا تو بھی ان کی موت واقع ہو جاتی - میں غلط تو نہیں کہہ رہا ڈاکٹر صاحب؟"

انسپکٹر جمشید کہتے کہتے ڈاکٹر فاضل کی طرف مڑے۔

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" انھوں نے فوراً کہا۔

"لہٰذا وہ زہریلا کیپسول انھوں نے اس شیشی میں شامل
کیا تھا۔ یہ حاتم غوری صاحب کی جان لینا چاہتے تھے،
کیوں لینا چاہتے تھے۔ یہ خود بتائیں گے۔"

"ن۔ نہیں۔ نہیں۔ یہ غلط ہے۔ میں نے ایسا کوئی
کام نہیں کیا۔ آخر آپ مجھ پر ہی کیوں شک کر رہے
ہیں۔ یہ کام تو اس گھر کا ہر فرد کر سکتا تھا۔ کوئی
ملازم بھی کر سکتا تھا، کیونکہ شیشی تو کئی روز سے ان کے
گھر میں ہے۔"

"اوہ ہاں واقعی۔ یہ پہلو میری نظر سے رہ گیا۔ گھر
کے ہر فرد کو بھی یہ آسانی میسر تھی کہ اس شیشی میں زہریلا
کیپسول شامل کر سکتا تھا۔ میں فی الحال آپ کو گرفتار نہیں
کر رہا۔ پہلے میں ان کے گھر کے افراد کو چیک کروں گا،
آپ جا سکتے ہیں، لیکن آپ شہر سے باہر جانے کی کوشش
نہیں کریں گے۔"

"ایک منٹ سر۔ یہ ابھی نہیں جا سکتے۔" اکرام نے
جلدی سے کہا۔

"کیوں۔ کیا بات ہے؟"

"ان کا بیان تو لینا ہوگا۔"

"اوہ ہاں واقعی۔ میں آج بھول بہت رہا ہوں۔ پتا نہیں

کیا بات ہے۔" یہ کہہ کر وہ مسکرائے۔

"میرا بیان ضرور لیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" اس
نے کہا۔

اکرام نے پہلے ایک فون کیا۔ فون پر وہ ایک منٹ تک
گھُر پھُر کرتا رہا۔ فون کمرے کے ایک کونے میں رکھا
تھا اور اسے اُٹھ کر وہاں تک جانا پڑا تھا۔ اس کی گھُر پھُر
کسی کے پلے نہیں پڑی تھی۔ واپس آ کر اس نے ڈاکٹر رضا
خان کا بیان لیا اور انھیں جانے کی اجازت دے دی۔

"اب مسٹر حاتم غوری آپ بتائیں۔ آپ کے گھر میں آپ
کے ساتھ کون کون رہتا ہے؟"

"ایک تو یہی ملازم۔ جس پر غداری کا الزام عاید کر دیا گیا
ہے۔ اور جو غلط نہیں ہے۔ گویا یہ کام اس کا بھی ہو سکتا
ہے، بلکہ زیادہ تر تو یہ اسی کا ہو گا۔" حاتم غوری نے کہا۔

"ہم اسے بھی چیک کریں گے۔ آپ گھر کے افراد کے
بارے میں بتائیں۔"

"گھر کا کوئی فرد ایسا کسی صورت نہیں کر سکتا۔ سب لوگ
مجھ پر جان چھڑکتے ہیں۔ میں نے اپنی ساری دولت اور
جائیداد پہلے ہی ان کے حوالے کر دی ہے۔ وہ اس
سے کاروبار کر سکتے ہیں، جس طرح چاہیں، اس کو کام

میں لا سکتے ہیں، میں کوئی دخل نہیں دیتا۔ ان حالات میں
کون فرد بھلا مجھے ہلاک کرنا چاہے گا۔ وہ تو میری زندگی
کی دعائیں کرتے نہیں تھکتے۔"

"ہوں! اس کے باوجود ہم تفتیش کریں گے۔ آپ یہ بتائیں،
کتنے افراد ہیں آپ کے گھر کے؟"

"میری بیوی۔ دو بیٹیاں اور دو بیٹے۔"

"اس وقت سب گھر میں ہیں؟"

"ہاں! ساتھ والے کمرے میں اور دروازے کی جھری
میں سے یہ ساری کارروائی سن رہے ہیں اور دیکھ بھی رہے
ہیں۔" حاتم غوری نے بتایا۔

"لیکن آپ کے بیٹے تو کمرے میں آ سکتے تھے۔" انسپکٹر جمشید
کے لہجے میں حیرت تھی۔

"وہ بہت شرمیلے ہیں، اور ابھی کم عمر ہیں۔ البتہ بیٹیاں
بڑی ہیں۔ وہ پردہ کرتی ہیں۔ میری بیگم بھی ایک پردہ دار
عورت ہیں۔"

"بہت خوب! یہ جان کر خوشی ہوئی۔ ہم پردے میں رہ
کر ان سے سوالات کریں گے۔"

"ضرور کیوں نہیں۔"

انھوں نے تفتیش شروع کی۔ اس میں بھی ایک گھنٹا

صرف ہوا اور پھر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ نہ تو یہ کام ملازم
کا ہے، نہ گھر کے کسی فرد کا۔ گویا صرف اور صرف ڈاکٹر
رضا خان کا تھا۔

"اب ڈاکٹر رضا خان کی گرفتاری ضروری ہے۔"

"میں ابھی اس کی گرفتاری کے لیے ہدایات دے دیتا ہوں،
یہاں سے وہ جونہی نکلا ہو گا، میرے آدمیوں نے اس
کی نگرانی شروع کر دی ہو گی۔ اسی لیے تو میں نے اسے
بیان لینے کے بہانے روک لیا تھا۔"

"ہاں! میں سمجھ گیا تھا۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے، پھر جلدی
سے بولے:

"لیکن بھئی۔ میرا خیال ہے کہ ابھی ہم ڈاکٹر رضا کو گرفتار
نہیں کرتے۔ البتہ اس کی نگرانی بہت زبردست انداز میں ہونی
چاہیے۔ اس بات کا زبردست امکان ہے کہ اس سے یہ کام
بیگم پاکیزہ نے لیا ہے۔"

"یس سر۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔"

"اب اگر بیگم پاکیزہ کی اس سے ملاقاتیں ثابت ہو جاتی ہیں،
بلکہ یہاں سے بھی وہ سیدھا اگر بیگم پاکیزہ کے پاس جاتا ہے
تو یہ بات اور بھی زیادہ مزے دار ہو گی۔"

"میں ابھی معلوم کرتا ہوں سر۔"

اکرام نے وائرلیس پر رابطہ قائم کیا اور رپورٹ پوچھی۔ معلوم ہوا کہ رضا خان اس جگہ سے سیدھا بیگم پاکیزہ کے ہاں گیا ہے۔

"اب تو معاملہ صاف ہو گیا سر۔ اس کی گرفتاری میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔"

"میں چاہتا تھا۔ پہلے بیگم پاکیزہ کے خلاف مکمل ثبوت حاصل کر لیا جائے، پھر ان دونوں کو گرفتار کر لیں گے۔ اب انھیں فرار تو ہونے نہیں دیا جائے گا، ان شاء اللہ!"

"جی ہاں! یہ تو ہے۔"

"ذرا ٹھہرو بھئی۔ میں گھر ایک فون کر لوں۔ بہت دیر سے میں نے محمود، فاروق اور فرزانہ سے رابطہ قائم نہیں کیا۔ نہ جانے وہ کن حالات کا شکار ہیں۔"

یہ کہ کر انسپکٹر جمشید نے گھر فون کیا اور پھر چونک اٹھے۔

نیلی آنکھیں

مل گئے کا نعرہ لگا کر محمود نے مختصر طور پر حالات سنائے اور پھر دوسری طرف کی بات سن کر ریسیور رکھ دیا:

"ابا جان فوراً یہاں کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔ یوں بھی جس کیس میں وہ الجھے ہوئے تھے۔ وہ انھوں نے قریب قریب مکمل کر لیا ہے۔"

"کمال ہے۔ ہماری مدد کے بغیر ہی۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"ایسا بھی ہوتا ہے۔" فاروق مسکرایا۔

"ہوتا ہو گا۔ مجھے اچھا نہیں لگتا ایسا۔"

"لیکن ہم نے بھی تو اس مرتبہ کچھ ایسا ہی کیا ہے۔" محمود مسکرایا۔

"کیا ایسا ایسا لگا رکھی ہے تم نے۔ لو کچھ کھا لو۔" بیگم جمشید نے جھلا کر کہا۔

انھوں نے دیکھا۔ کھانا بالکل تیار تھا اور یوں لگتا تھا

جیسے ابھی ابھی تیار کیا گیا ہو گا۔

"ایک تو یہ بات آج تک سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ اس قدر جلد کھانا کس طرح تیار کر لیتی ہیں۔"

"یہ باورچی خانے کا راز ہے۔ جو میں تمھیں نہیں بتا سکتی۔" بیگم جمشید نے شوخ آواز میں کہا۔

"باورچی خانے کا راز۔ یہ۔ یہ تو کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے۔" فاروق نے فوراً کہا۔

"ہو سکتا ہو گا۔ بھاڑ میں جائیں۔ ناولوں کے نام۔ یار میں کہتا ہوں۔ تم کوئی مصنّف کیوں نہیں بن جاتے۔" محمود نے تلملا کر کہا۔

"سوچتا ہوں، پھر تم دونوں کا کیا ہو گا۔ ہر کیس میں بس ٹامک ٹوئیاں مار کر رہ جایا کرو گے۔"

"ہائیں ہائیں۔ تو کیا کیس میں کامیابی ہم صرف تمھاری موجودگی کی وجہ سے کرتے ہیں۔" فرزانہ کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

"ہاں تو اور کیا۔" فاروق بولا۔

"ارے، میاں جاؤ۔ ہوا کھاؤ۔"

"ہوا کھائے بغیر تو میں زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔ مطلب یہ کہ وہ تو پہلے ہی کھا رہا ہوں۔ اب تو یہ کھانا ہے جو امی جان نے سامنے رکھا ہے۔ بھئی واہ۔ امی ہو تو ان جیسی۔"

وہ مسکرا دیے اور کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ابھی پوری طرح فارغ نہیں ہوئے تھے کہ دستک ہوئی۔ انداز انسپکٹر جمشید کا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی السلامُ علیکم، وعلیکم السلام کی آواز گونج اٹھی۔

"میں سب سے پہلے تفصیل سے حالات سننا چاہتا ہوں۔"

"ہم ذرا فارغ ہو لیں۔ بلکہ قریب قریب ہو ہی چکے ہیں۔"

فارغ ہونے کے بعد انھوں نے تمام حالات تفصیل سے سنائے اور پھر ان سے بولے:

"اب آپ بتائیں۔ آپ اب تک کن حالات میں گھرے رہے ہیں؟"

"ہم ایک ہی کیس میں الگ الگ اُلجھے رہے۔ اور اس طرح یہ کیس دو راستوں سے حل ہوا ہے۔ صرف مجرموں کی گرفتاری باقی رہ گئی ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ ان مجرموں کے پیچھے بھی کسی کا ہاتھ ہے۔ یا بیگم پاکیزہ ہی یہاں کی سرغنہ ہے۔"

"یہ بات تو خیر نگرانی سے معلوم ہو ہی جائے گی۔"

"اور نگرانی ان دونوں کی ..."

عین اس وقت فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ انسپکٹر جمشید نے ریسور اٹھایا اور بولے:

"انسپکٹر جمشید بات کر رہا ہوں۔"

پھر وہ دوسری طرف کی بات سننے، آخر ریسیور رکھتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے اور بولے:

"ہمارے آدمیوں کی طرف سے خاص اطلاع ملی ہے۔ لہٰذا ہمیں ابھی اور اسی وقت جانا ہو گا۔ آپ لوگ بے شک آرام کریں۔ ہم دیکھ ہی لیں گے۔"

"لیکن جمشید۔ اس طرح تو مزا نہیں آئے گا۔"

"تو پھر آئیے۔"

وہ سب وہاں سے روانہ ہوئے۔ بیگم جمشید نے اندر سے دروازہ بند کر لیا:

"اطلاع کیا ملی ہے سر؟"

"وہ دونوں اس وقت بہت تیزی کے عالم میں ایک سمت میں روانہ ہوتے ہیں۔ ان کے آگے اور پیچھے ہماری کئی گاڑیاں آلات کی مدد سے تعاقب کر رہی ہیں۔ گاڑیوں کو سامنے آنے کی ضرورت نہیں۔ وہ وائرلیس کے ذریعے آپس میں رابطہ رکھے ہوتے ہیں۔"

"بہت خوب! اب آئے گا مزا۔" محمود نے خوش ہو کر کہا۔

"تعاقب شروع ہوا نہیں اور اسے مزا آیا نہیں۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"تو تمھیں کس نے روکا ہے۔" فرزانہ مسکرائی۔

"جہاں تک میرا خیال ہے۔ خود بیگم پاکیزہ بھی کسی کے احکامات پر عمل کرتی ہے۔"

"سوال یہ ہے کہ وہ کون ہے؟"

"اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے ہی تو یہ تعاقب ہو رہا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اور دوسری طرف شارجستان کا رویہ سمجھ میں نہیں آیا۔ آخر وہ کیوں اچانک ہماری سرحدوں پر اُمڈ پڑا ہے؟"

"حملہ کرنے کا پروگرام بن گیا ہو گا۔" خان رحمان بولے۔

"اللہ اپنا رحم فرمائے۔ صدر صاحب کو بھی فوری طور پر سرحد کی طرف توجہ دینا پڑی ہے۔"

"اور بے چارے کر بھی کیا سکتے ہیں۔"

عین اسی وقت اشارہ موصول ہوا:

"سر۔ یہ لوگ تو۔ تو۔۔!"

"ٹھیک ہے۔ تعاقب جاری رہے۔ میں دیکھ چکا ہوں۔ تم نزدیک نہ جانا۔"

"آپ کیا دیکھ چکے ہیں؟"

"جہاں وہ جا رہی ہے۔"

"اوہ اچھا۔ اب تو راستا دیکھ کر ہماری سمجھ میں بھی

آ گیا۔"

تعاقب آدھ گھنٹے تک جاری رہا، پھر انھیں اپنی گاڑی روک لینا پڑی۔ سادہ لباس والے اب ان سے پیچھے رہ گئے تھے۔ آگے راستا نہیں تھا:

"آپ آگے نہیں جا سکتے۔" عمارت کے دروازے پر جو دربان تھے، ان میں سے ایک نے کہا۔

"کیوں جناب! ہم اندر کیوں نہیں جا سکتے۔ یہ ہمارا ملک ہے۔ ہم اس میں ہر جگہ جا سکتے ہیں۔"

"آپ اپنے کارڈ دے دیں۔"

انسپکٹر جمشید نے صرف اپنا کارڈ دے دیا۔

"باقی لوگوں کے کارڈ۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔ یہی کافی ہے۔" انھوں نے منہ بنایا۔

"تب پھر صرف آپ اندر جا سکیں گے۔ وہ بھی اجازت ملنے کی صورت میں۔"

"کوئی بات نہیں۔ آپ صرف میرا کارڈ لے جائیں۔" انھوں نے کہا۔

وہ کارڈ لے کر اندر چلا گیا۔ دو منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی۔ اس نے طنزیہ انداز میں کہا:

"کل گیارہ بجے آپ سے ملاقات کا وقت طے ہوا ہے۔"

"نہیں بھئی۔ ہمیں ابھی اور اسی وقت اندر جانا ہے۔ اب یہ کارڈ لے کر جاؤ۔" انھوں نے دوسرا کارڈ نکال کر دیا۔ دربان نے کارڈ کو حیرت سے دیکھا:

"اس سے کیا فرق پڑ جائے گا؟"

"آپ کارڈ لے جائیں۔ بحث نہ کریں۔" انسپکٹر جمشید نے سرد آواز میں کہا۔

وہ کانپ گیا اور فوراً اندر چلا گیا۔ اس مرتبہ وہ تین منٹ بعد واپس آیا اور بولا:

"سر! انھوں نے کہا ہے۔ کہ کل گیارہ بجے سے پہلے ملاقات ممکن نہیں۔"

انسپکٹر جمشید نے ان کی طرف دیکھا اور پھر ان کے ہاتھوں میں پستول نظر آئے:

"اب ہم مزید برداشت نہیں کر سکتے۔"

"کیا مطلب؟" دربان اچھل پڑے۔

"ہمارے آگے آگے چلو۔ اور جہاں یہ صاحب بیٹھے ہیں، ہمیں سیدھا وہیں لے کر چلو۔"

"جج۔ جی۔ بہتر۔" دونوں ایک ساتھ ہکلائے۔

جلد ہی وہ ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ فوراً ہی اندر ایک آواز گونجی:

"کیا مطلب؟"

"کمرے میں نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک صوفے پر بیگم پاکیزہ اور ڈاکٹر رضا خان بیٹھے تھے۔ سامنے والے صوفے پر ایک گہری نیلی آنکھوں والے صاحب بیٹھے تھے۔ کیا مطلب انھی کے منہ سے نکلا تھا:

"مجھے انسپکٹر جمشید کہتے ہیں۔"

"لیکن میں نے تو آپ کو کل گیارہ بجے کا وقت دیا ہے۔"

"ہم وہ لوگ نہیں۔ جنھیں وقت لے کر کہیں جانا پڑے، کیا سمجھے آپ۔"

"ایک منٹ۔" یہ کہہ کر اس نے ریسیور میں کچھ ہدایات دیں، پھر ان کی طرف مڑا:

"آپ تشریف رکھ لیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"میں جانتا ہوں۔ آپ نے کیا ہدایات دی ہیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"آپ کیسے جانتے ہیں۔ جب کہ یہ میرا مخصوص زبان میں اشارہ تھا۔" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"یہ ایک پیشہ وارانہ راز ہے۔ میں بتا نہیں سکتا۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"چلیے نہیں بتا سکتے تو کوئی بات نہیں۔" فاروق بول اٹھا۔

"کیا کر رہے ہیں آپ؟" نیلی آنکھوں والا حیران ہو کر بولا۔

"یہ باتیں آپ کے پلے نہیں پڑیں گی۔"

عین اس وقت کمرے کا دروازہ زوردار آواز سے کھلا اور ملٹری کے جوان دھڑا دھڑ اندر آنے لگے۔ یہاں تک کہ کمرے میں جگہ کم پڑ گئی:

"انھیں گرفتار کر لیا جائے۔" نیلی آنکھوں والے نے کہا۔

"ضرور سر۔ کیوں نہیں۔"

"لیکن کس جرم میں؟"

"یہ بغیر اجازت اندر داخل ہوئے ہیں۔"

"بس! صرف اس جرم کی بنا پر آپ ہمیں گرفتار کروا رہے ہیں۔"

"ہاں! اور کیا۔" اس نے کہا۔

"آپ ہمیں گرفتار نہیں کرا سکتے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کیا صرف اس لیے کہ آپ انسپکٹر جمشید ہیں۔"

"نہیں۔ ہمارے ملک کا کوئی آفیسر بھی قانون کے خلاف حرکت کرے، اسے گرفتار کیا جانا چاہیے، لیکن مشکل یہ ہے کہ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ مجھے اس ملک کے سربراہ کی طرف سے اجازت ہے۔ یہ دیکھیے۔" یہ کہہ کر انھوں نے اپنا خصوصی اجازت نامہ اس کے سامنے کر دیا۔ پہلے اس

نے اجازت نامہ پڑھا، پھر ملٹری آفیسر نے۔ اس نے پڑھ کر کہا:

"ہم تو انھیں گرفتار نہیں کر سکتے سر۔"

"ٹھیک ہے، پھر آپ جائیں۔" نیلی آنکھوں والے نے جل کر کہا اور فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"ابھی آپ لوگ نہ جائیں۔ شاید آپ کی یہاں ضرورت پڑ جائے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ہماری بجائے ہو سکتا ہے، آپ کو انھیں گرفتار کرنا پڑ جائے۔"

"یہ کیا بکواس ہے؟" نیلی آنکھوں والے نے چلّا کر کہا۔ عین اسی وقت سلسلہ مل گیا اور کسی نے دوسری طرف سے اسے بُری طرح جھاڑ دیا۔

"اوہ نہیں سر۔ یہ میں نے آپ سے نہیں کہا۔" یہ کہہ کر وہ جلدی جلدی انسپکٹر جمشید کے بارے میں بتانے لگا، پھر ریسیور ان کی طرف بڑھا کر بولا:

"لو انسپکٹر۔ خود اپنے کانوں سے حکم سُن لو۔"

"شکریہ!" وہ بولے اور ریسیور لے لیا۔ دوسری طرف سے صدرِ مملکت کی آواز سُن کر وہ چونکے، کیونکہ انھیں ایک فی صد

اُمید نہیں تھی کہ وُہ یک دم صدر تک جا پہنچے گا:

"ہیلو جمشید۔ کیا معاملہ ہے؟"

"مجھے مسٹر رابرٹ سے کچھ سوالات کرنا تھے سر۔ انھوں نے ملاقات کی اجازت نہیں دی۔ کل کا وقت دے رہے تھے۔ میں نے اپنا خصوصی کارڈ بھیجا تو بھی انھوں نے اجازت نہیں دی۔ اب میں کیا کرتا۔ اپنے اختیارات استعمال کر کے اندر داخل ہو گیا۔ انھوں نے حفاظتی عملے کو بُلا لیا، لیکن میرا اجازت نامہ دیکھ کر وُہ مجھے کچھ نہ کہہ سکے تو انھوں نے آپ کو فون کیا۔"

"وُہ سوالات کس قسم کے ہیں؟"

"بہت اہم نوعیت کے۔ اور فوری نوعیت کے بھی۔ اگر فوری طور پر نہ کیے گئے تو مُلک کو خوفناک قِسم کا نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

"اوہ اچھا۔ خیر۔ تم سوالات کرو، لیکن انھیں پریشان نہ کرنا۔"

"اگر انھوں نے سوالات کے جواب دے دیے تو۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کیا مطلب؟" صدر صاحب چونکے۔

"اگر یہ جواب نہ دے سکے تو۔ پھر میں مجبور ہوں گا سر۔"

"مجھ سے پُوچھے بغیر کوئی قدم نہ اُٹھانا جمشید۔"

"جی بہتر۔" وہ بولے۔

"اب ریسیور مسٹر رابرٹ کو دے دو۔"

انھوں نے ریسیور ان کی طرف بڑھا دیا۔ دوسری طرف کی بات سُن کر رابرٹ نے ڈھیلے ڈھالے انداز میں ریسیور رکھا اور ان کی طرف مڑا:

"تمھیں کیا پوچھنا ہے مسٹر؟"

"پہلا سوال۔ بیگم پاکیزہ اور مسٹر رضا خان سے آپ کا کیا تعلق ہے، یہ یہاں کیوں نظر آ رہے ہیں۔" انھوں نے پُرسکون آواز میں کہا۔

"یہ میرے دوست ہیں۔"

"کس قسم کے دوست۔ بہت گہرے یا عام سے دوست؟"

"گہرے دوست ہیں۔"

"شکریہ! گہرے دوست ہونے کا کیا یہ مطلب بھی ہوتا ہے کہ یہ آپ کے ساتھ مل کر ہمارے مُلک کو نقصان پہنچا سکتے ہیں؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کیا مطلب! یہ کس نے کہہ دیا آپ سے۔" رابرٹ نے چونک کر کہا۔

"آپ اس بات کو چھوڑیں کہ میری اطلاع کے ذرائع کیا ہیں۔ میرے سوال کا جواب دیں۔"

"نہیں! اس کا یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا۔ نہ انھوں نے مُلک اور قوم کو کوئی نقصان پہنچایا ہے۔"

"اوہ اچھا۔ تب تو معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔" وہ مسکرائے۔

"صاف ہو جاتا ہے۔ کیا مطلب؟" رابرٹ نے جھلّا کر کہا۔

"اگر انھوں نے آپ سے مل کر مُلک اور قوم کو نقصانات پہنچائے ہیں تو یہ اور آپ مجرم۔"

"ٹھیک ہے۔ ثابت کریں۔" رابرٹ نے چلّا کر کہا۔

جاسوسی کیسے

"فکر نہ کریں۔ میں ثابت کروں گا۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"آپ کتنا وقت لیں گے یہ ثابت کرنے میں؟" رابرٹ نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"کیوں۔ کیا بات ہے؟"

"مجھے ایک دو بہت ضروری فون کرنا تھے۔"

"تو پھر آپ پہلے فون کرلیں۔"

"شکریہ! میں ابھی آتا ہوں۔"

یہ کہ کر وہ اٹھا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ پندرہ منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی:

"آپ فارغ ہو چکے ہیں؟"

"ہاں! اب آپ اپنا ثبوت پیش کر سکتے ہیں۔"

"بہت خوب!" انسپکٹر جمشید نے خوش ہو کر کہا اور جیب میں ہاتھ ڈالا۔ عین اسی وقت ایک ملازم اندر داخل ہوا:

"صدر صاحب اور کچھ دوسرے لوگ تشریف لائے ہیں سر۔"

"اوہ اچھا۔" رابرٹ کھڑا ہو گیا۔ باقی لوگ بھی اٹھ گئے۔

اس وقت صدر صاحب، وزیر اعظم، کئی وزرا اور دوسرے بڑے بڑے سرکاری آفیسر اندر داخل ہوئے۔ انسپکٹر جمشید حیرت زدہ رہ گئے۔ انھوں نے سوچا۔ تو یہ تھے، وہ ایک دو ضروری فون۔

"آپ لوگ بہت اچھے وقت پر آئے۔ میں آپ لوگوں کی ضرورت بھی محسوس کر رہا تھا۔ یہ آپ کے انسپکٹر جمشید۔ آخر یہ کون ہوتے ہیں میرے معاملات میں دخل اندازی کرنے والے۔ مسٹر صدر! کیا یہ دخل اندازی کر سکتے ہیں؟"

"ن۔ نہیں۔" صدر صاحب نے گھبرا کر کہا۔

"تو پھر آپ ان سے پوچھیے۔ یہ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"جمشید۔ بتاؤ۔" صدر صاحب ناخوش گوار لہجے میں بولے۔

"جی بہتر۔ ابھی بتاتا ہوں۔" انھوں نے کہنا چاہا، لیکن رابرٹ نے ٹوک دیا:

"نہیں سر۔ کچھ نہ پوچھیں۔ بس ان سے کہیں۔ یہ یہاں سے چلے جائیں۔ اگر میرے خلاف کوئی بات ہے تو وہ آپ سے کہیں۔ یہ یہاں آکر مجھ سے پوچھ گچھ نہیں کر سکتے۔"

"ہاں! ٹھیک ہے۔ نہیں کر سکتے۔" وزیر اعظم بولے۔

"لیکن کیوں سر۔ آخر کیوں نہیں کر سکتا؟"

"اس لیے کہ تم صرف ایک انسپکٹر ہو۔" وزیرِ اعظم نے تیز آواز میں کہا۔

"اور میرے پاس خاص قسم کے اجازت نامے ہیں۔ ان میں یہ بھی ہے کہ میں مُلک اور قوم کے کسی بھی معاملے میں کہیں بھی دخل اندازی کر سکتا ہوں۔"

"یہ اجازت نامہ صدر صاحب کی طرف سے مِلا ہے نا؟" وزیرِ اعظم بولے۔

"جی ہاں بالکل۔"

"تو پھر اسی وقت سے کینسل۔" انھوں نے کہا۔

"شکریہ سر۔ مجھے کوئی افسوس نہیں ہوا۔ نہ کوئی خوشی ہوئی، لیکن میں اپنی بات پھر بھی کروں گا۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔ تم ابھی اور اسی وقت یہاں سے جا سکتے ہو۔ تم اس مُلک میں کسی عہدے پر مُلازم نہیں ہو۔" وزیرِ اعظم نے بھنا کر کہا۔

"بہت بہت شکریہ سر۔"

"میرا خیال ہے۔ جمشید کی بات سُن تو لی جائے۔" صدر صاحب دبی آواز میں بولے۔

"جی نہیں۔ نہیں سُنی جائے گی۔" رابرٹ نے جھلا کر کہا۔

"لیکن مسٹر رابرٹ۔ اس چیز کے بارے میں آپ اگر بتا یں تو حرج ہی کیا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے اچانک ہتھیلی ان سب کے سامنے کر دی۔

سب نے دیکھا۔ ایک سیاہ رنگ کا بالکل گول بٹن سا ان کی ہتھیلی پر رکھا تھا۔

"میں کہتا ہوں۔ نکل جاؤ۔ ورنہ شوٹ کروا دوں گا۔ اور اگر میں نے تمھیں اپنے دفتر میں ان سب لوگوں کی موجودگی میں شوٹ کروا دیا تو بھی مجھ پر کوئی الزام نہیں عاید کیا جائے گا۔"

"ہاں! نہیں کیا جائے گا۔" وزیرِ اعظم فوراً بولے۔

"میرے مُلک میں۔ ایک غیر مُلکی ایک قتل کرے۔ اور اسے قانون پوچھ نہ سکے۔ اس سے زیادہ بے بسی کی بات کوئی اور ہو بھی نہیں سکتی۔ اور اسی سے یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ ہمارے مُلک پر ہم لوگوں کی حکومت نہیں ہے۔ دُوسرے حکومت کر رہے ہیں۔ وہ جو چاہتے ہیں، کرتے ہیں۔ اور..."

"اب معاملہ برداشت سے باہر ہے۔ انسپکٹر جمشید کو گرفتار کر لیا جائے۔" وزیرِ اعظم نے حکم دیا۔

"میں اس حکم کے خلاف ہوں۔ اسے جانے دیا جائے۔" صدر صاحب بولے۔

"سر۔ یہ آپ کہ رہے ہیں۔ آپ دیکھ نہیں رہے۔ انسپکٹر

جمشید کس طرح جرأت پر اُتر آئے ہیں۔"

"انسپکٹر جمشید کی مُلک کے لیے خدمات کو بھی ذہن میں رکھیں۔ کیا ہمارے مُلک کا کوئی جج انسپکٹر جمشید کو سزا سُنا سکتا ہے۔ وہ کس جرم کے تحت سزا سُنائے گا؟"

"ہم عدالت میں کیوں لے جائیں گے۔ سیدھا جیل پہنچا دیں گے۔" وزیرِ اعظم بولے۔

"یہ اتنا آسان بھی نہیں، پُورا مُلک اُٹھ کھڑا ہو گا۔"

"دیکھا جائے گا۔ پورا ملک پہلے بھی اٹھ کھڑا ہوتا رہتا ہے۔" وزیرِ اعظم بولے۔

"آپ انہی کے ووٹوں سے وزیرِ اعظم بنے ہیں۔" صدر صاحب بولے۔

"آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"دُنیا کی ہر عدالت ملزم کو اپنی صفائی کا موقع دیتی ہے، انسپکٹر جمشید کو یہ موقع کیوں نہیں دیا جا رہا۔" صدر صاحب بولے۔

ہال میں تھوڑی دیر کے لیے سناٹا طاری ہو گیا۔ آخر وزیرِ اعظم بولے:

"ٹھیک ہے۔ انسپکٹر جمشید اپنی صفائی پیش کریں۔"

"مسٹر رابرٹ صرف یہ بتا دیں۔ کہ میری ہتھیلی پر رکھی یہ چیز کیا ہے؟"

"میں کیا جانوں۔ میرا اس سے کیا تعلق۔"

"حضرات! یہ جملہ نوٹ کر لیا جائے۔ سب لوگ اپنے ذہنوں میں ہی نہیں، کاغذات پر بھی نوٹ کر لیں۔"

"ہم ضرور نوٹ کریں گے جمشید۔" خان رحمان اور پروفیسر داؤد ایک ساتھ بولے۔

"اوہو۔ پروفیسر صاحب۔ آپ بھی تشریف فرما ہیں۔"

"ہاں! اور بہت دیر سے برداشت کر رہا ہوں۔ ایک محبِ وطن کی زبان بند کرنے کی کوششوں کو خون کے آنسو روتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔"

"آپ نہیں جانتے پروفیسر صاحب۔ انشارجہ کے سفارت کار کی ہمارے ہاں کیا اہمیت ہے۔" وزیرِ اعظم فوراً بولے۔

"ہاں! ننھا سا بچہ ہوں نا۔ کہ نہیں سمجھ سکتا۔ بہرحال یہ بات بھی نوٹ کر لیں۔ اگر انسپکٹر جمشید کے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی تو ہم بھی اس کا ساتھ دیں گے، کیوں خان رحمان؟"

"بالکل!" وہ فوراً بولے۔

"خیر سُنیں۔ مسٹر رابرٹ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"میں اس چیز کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"اکرام۔ سامنے دیوار پر فلم چلا دو۔"

"کیا مطلب؟"

"چند اجلاسوں کی فلم۔ ان میں آپ اپنے کالر پر یہ چیز لگائے ہوئے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"نن۔ نہیں۔" رابرٹ نے چلا کر کہا۔

"انسپکٹر جمشید بلاوجہ کسی پر کوئی الزام نہیں لگایا کرتا۔"

"مجھے یاد آیا۔ کالر میں پھول کی طرح لگانے کے لیے یہ مجھے کسی نے دیا تھا۔ یہ تو ایک ایسی ہی چیز ہے بس۔"

"چلیے! آپ نے تسلیم تو کیا کہ یہ آپ کے کالر میں لگی ہوتی ہے۔ اب میں آپ کو چند تصاویر دکھانا پسند کروں گا۔ اکرام تصویر نمبر ایک۔" وہ بولے۔

دیوار پر ایک تصویر بالکل واضح نظر آنے لگی۔ اس تصویر میں مسٹر رابرٹ تو تھے ہی۔ انشارجہ کا ایک بڑا سائنس دان پروفیسر کوٹان جان بھی تھا۔ دونوں کے کالروں پر یہ سیاہ چیز لگی تھی۔

"آپ دیکھ رہے ہیں کالروں میں لگی چیز کو؟"

"ہاں!" سب نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"اب ذرا ان محترمہ کی طرف بھی دیکھ لیں۔ یہ بھی اجلاس میں شریک ہیں۔" انھوں نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔

"اوہو! بیگم پاکیزہ۔" کئی آوازیں ابھریں۔

"محمد حسین۔ بیگم پاکیزہ کو اندر لے آؤ۔ تاکہ یہ بھی خود کو اس تصویر میں دیکھ لیں۔"

"اوہ۔ تو آپ بیگم پاکیزہ کو بھی یہاں لاتے ہیں۔" وزیر اعظم چونکے۔

"یس سر۔ ان کی بھی ضرورت تھی۔"

بیگم پاکیزہ کو اندر لایا گیا اور ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ انسپکٹر جمشید مسکرا کر بولے:

"آپ بھی اس تصویر میں اپنے آپ کو اور کالر میں لگی سیاہ رنگ کی چیز کو دیکھ لیں۔"

اس کے منہ سے کچھ نہ نکلا۔ بس ٹکر ٹکر تصویر کو دیکھتی رہی۔

"اب میں چند اور تصاویر دکھاتا ہوں۔"

اکرام نے تصاویر دکھانا شروع کیں۔ ہر تصویر میں بیگم پاکیزہ وہ چیز لگائے ہوئے موجود تھیں۔ کوٹان جان موجود تھا۔ البتہ رابرٹ کسی میں تھا، کسی میں نہیں تھا۔ سیاہ چیز البتہ ہر تصویر میں لازمی چیز تھی۔

"آپ نے دیکھا۔ اس کے بغیر ان لوگوں نے کسی اجلاس میں شرکت نہیں کی۔"

"ہاں!" صدر صاحب بولے۔

"اب آپ لوگ کیا کہتے ہیں۔ ہم مسٹر رابرٹ سے اس
چیز کے بارے میں پوچھنے کا حق رکھتے ہیں یا نہیں؟"

"نہیں رکھتے۔" وزیر اعظم بولے۔

"آخر کیوں سر۔ یہ ہمارا ملک ہے۔ اس ملک کو ہمارے
بزرگوں نے اپنا خون دے کر بنایا ہے۔ اس ملک کے ایک
ذرّے کو بھی کوئی نقصان پہنچائے۔ مجھ سے تو یہ دیکھا نہیں
جاتا۔ اس مُلک میں کوئی زہر کا بیج بوئے۔ مجھ سے تو
یہ برداشت نہیں ہوتا۔ اس ملک میں کوئی فساد کی آگ
بھڑکائے، مجھ سے تو یہ دیکھا نہیں جاتا۔ اور اگر کوئی اس
مُلک کا بالکل ہی بیڑہ غرق کرنے کی ٹھان لے۔ مجھ سے یہ
کس طرح برداشت ہو جائے گا سر۔"

"میرا خیال ہے۔ اب تک انسپکٹر جمشید کافی تقریر کر چکے
ہیں۔ انھیں اب یہاں سے باہر نکال دیا جائے۔" رابرٹ
نے چلّا کر کہا۔

ان سب نے جیسے اس کا جملہ سُنا ہی نہیں۔ انسپکٹر جمشید
کے الفاظ نے سب پر جادو سا کر دیا تھا۔ وہ ان کی
باتیں سُننے پر مجبور ہو چکے تھے اور چاہتے تھے کہ انسپکٹر
جمشید باتیں کرتے چلے جائیں۔

"بات جاری رکھو جمشید۔"

"مسٹر صدر! یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔" رابرٹ چلّایا۔

"اگر انسپکٹر جمشید الزام ثابت نہ کر سکے تو ہم آپ کے سامنے
انہیں شوٹ کریں گے۔" صدر صاحب بولے۔

"میں خوشی سے سزا قبول کر دوں گا سر۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"اچھی بات ہے۔ آپ سب لوگ انسپکٹر جمشید کی باتوں کو
اہمیت دینے پر تُل گئے ہیں تو پھر ایک بات سُن لیں۔"

"فرمائیے۔"

"اس وقت شارجستان نے آپ لوگوں کی سرحدوں پر اپنی فوجیں
جمع کر رکھی ہیں یا نہیں؟"

"ہاں! کر رکھی ہیں اور ہم اب تک اس کی وجہ نہیں جان سکے۔"

"یہ فوجیں میرے اشارے پر جمع کی گئی ہیں۔ اور میرے
ایک اشارے کی دیر ہے۔ فوجیں اچانک حملہ آور ہو جائیں
گی۔ یہ بھی سُن لیں۔ یہ جنگ صرف زمینی نہیں رہ جائے گی،
ہوائی اور بحری فوج کا بھی حملہ ہوگا۔ اور جب تک میں نہ
چاہوں گا۔ جنگ بند نہیں ہو گی۔ اب آپ سوچ لیں۔
انسپکٹر جمشید کی بات سُننی ہے یا نہیں۔"

"گویا اگر ہم نے ان کی بات سُنی تو جنگ چھڑے گی،
ورنہ نہیں۔"

"ہاں! یہی بات ہے۔"

ان سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر نظریں جمشید پر جم گئیں:

"یہ ٹھیک ہے سر۔ جنگ چھڑ سکتی ہے، لیکن ہمارے سامنے دو راستے ہیں۔ یا تو اس جنگ کو برداشت کریں۔ یا پھر کچھ مدت بعد پورے ملک سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔"

"کیا مطلب۔ ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ بھلا کوئی اپنے ملک سے بھی ہاتھ دھوتا ہے۔" صدر صاحب نے چونک کر کہا۔

"ہاں! ایسا بھی ہوتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس دنیا میں کیا نہیں ہو سکتا۔" یہ کہتے وقت انسپکٹر جمشید مسکرائے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

"اپنی بات کی وضاحت کرو جمشید۔"

"میں کر چکا ہوں۔ اب ایک لفظ نہیں سنوں گا۔" رابرٹ نے کہا۔

"آؤ جمشید۔ یہاں سے چلیں۔ میں تمہاری بات باہر جا کر سن لیتا ہوں۔" صدر صاحب بولے۔

"نہیں سر۔ وہ بات ہو گی تو سب کے سامنے، ورنہ ہو گی نہیں۔"

"تو پھر پہلے جنگ کے دھماکے سن لیں۔" یہ کہ کر اس نے ایک بٹن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"مسٹر رابرٹ۔ آپ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتے، کیونکہ پوری طرح میرے پستول کی زد میں ہیں۔"

"کیا!!!" رابرٹ حلق پھاڑ کر چلایا۔

"ہاں! اگر یقین نہیں تو ادھر دیکھ لیں۔ میرے کوٹ کی جیب میں ابھری ہوئی یہ نوک بالکل آپ کے دل کا نشانہ لیے ہوئے ہے۔ اور جونہی آپ نے حرکت کی۔ گولی چل جائے گی۔" وہ بولے۔

"آپ لوگ سن رہے ہیں؟"

"ہاں! سن رہے ہیں۔ آپ کی باتیں بھی سنی ہیں اور انسپکٹر جمشید کی۔ اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ آپ کو ہمارے ملک سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ آپ تو اس کو جنگ کے شعلوں میں دھکیل دینے پر تل گئے ہیں۔ صرف اپنے پر لگنے والے الزام کی وجہ سے۔ جو کہ ابھی تک لگایا بھی نہیں گیا۔"

"کیا آپ لوگ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اب آپ انسپکٹر جمشید کی بات سننا چاہتے ہیں؟"

"ہاں! یہی بات ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ آپ سنتے رہیے۔" یہ کہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی وقت اس کی کن پٹی

سے پستول کی نال آ لگی۔

"آپ جا بھی تو نہیں سکتے جناب۔"

"یہ۔ یہ کیا ہے۔ میں کہتا ہوں۔ اس کا انجام بہت بھیانک ہوگا۔"

"اب جو بھی ہو۔ دیکھا جائے گا۔" صدر صاحب بولے۔ وزیرِ اعظم صاحب تو شاید بات کرنا بھول گئے تھے۔

"اچھی بات ہے۔ انجام کے ذمے دار آپ خود ہوں گے، پوری دنیا میں آپ کا ملک بے یار و مددگار ہو کر رہ جائے گا۔ ہر ملک مخالفت کرے گا۔ یہاں تک کہ تمام اسلامی ممالک بھی آپ لوگوں کی مخالفت کریں گے۔ کسی جگہ سے کوئی امداد قطعاً نہیں ملے گی۔ پھر آپ لوگ کیا کریں گے۔"

"ایک جگہ سے ہمیں امداد ضرور ملے گی۔ اور اس جگہ کی امداد کو آپ کسی صورت بھی روک نہیں سکیں گے۔"

"ہوں! یہ دھمکی ہے۔ کھلی دھمکی۔" وزیرِ اعظم نے بھنا کر کہا۔

"آپ بھی ان سب کا ساتھ دینے گے۔ بھول گئے آپ، آپ کو وزیرِ اعظم بنوانے میں میرے ملک کا کتنا حصہ ہے۔ اگر میرا ملک آپ کا ساتھ نہ دیتا۔ تو آپ اتنے ووٹ لے

سکتے تھے۔"

"لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اس ملک کا ہی سودا کر ڈالوں۔"

"یہ آپ کا خیال ہے۔ ملک کا سودا کون کر رہا ہے۔"

انھوں نے منہ بنایا۔

"تو پھر۔ ٹھیک ہے۔ اب میں دیکھ لوں گا۔" اس نے جھلا کر کہا۔

"آپ شاید اس خیال میں ہوں گے کہ آپ کو ناپسندیدہ شخصیت قرار دے کر یہاں سے رخصت کر دیا جائے گا۔"

"تو اور آپ میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟"

"اس پر ہم بعد میں بات کریں گے۔ کہ آپ کا کیا کیا جائے اور کیا نہیں۔ فی الحال ہم انسپکٹر جمشید کی کہانی سنیں گے۔"

"ضرور سن لیں۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"میری کہانی بیگم پاکیزہ کے باپ سے شروع ہوتی ہے۔ ان کے والد ایک بہت بڑے جاگیردار تھے۔ مسلمانوں سے غداری کرنے کا انعام انھیں انگریزوں نے بہت بڑی جاگیر کی صورت میں دیا تھا۔ غداری کے نتیجے میں ملنے والی جاگیر کے بل پر یہ شروع سے بڑے

آدمی گِنے جاتے رہے۔ بڑے بڑے آفیسرز کی دعوتیں
کرتے رہتے تھے۔ پھر ان کی بیٹی میدان میں آئی۔
اس نے ایک غیر مُلکی سے شادی کی۔ بات اگر یہاں
تک رہتی تو کوئی عجیب نہ ہوتی، لیکن بات اس سے
بہت آگے جا نکلی۔ یہ شادی بہت سوچ سمجھ کر
ایک زبردست منصوبے کے تحت کی گئی تھی۔ یُوں کہہ
لیں کہ یہ ایک سازشی شادی تھی۔"

"جی۔ کیا فرمایا۔ سازشی شادی۔" فاروق اچھل پڑا۔
وُہ سمجھ گئے کہ فاروق کیا کہنا چاہتا ہے۔ دل ہی دل
میں مسکرا دیے، پھر بولے:

"ہاں! سازشی شادی، بیگم پاکیزہ کا باپ انگریزوں
کا وفادار رہا۔ بیگم پاکیزہ بھی اسی ماحول میں ہی پلی
بڑھیں۔ لہٰذا یہ بھی ان لوگوں کی وفادار بن گئیں۔
پھر انشارجہ کی سکیم کے مطابق وہاں کے ایک سائنس دان
کی شادی ان سے کرا دی گئی۔ وہ انشارجہ کا خاص
آدمی تھا۔ اور جاسوسی کی غرض سے اس ملک میں
بھیجا گیا تھا، اسے بتا دیا گیا تھا کہ اب اسے اس
ملک میں رہنا ہوگا۔ لہٰذا شادی بھی کرے اور
شادی بھی ایسی عورت سے جو ان کے ہر قدم پر

کام آ سکے۔ اس طرح بیگم صاحبہ کے شوہر مُلک کے
خلاف جاسوسی کرتے رہے۔ ان کی موت کے بعد
انشارجہ نے بیگم پاکیزہ کو اور زیادہ اہمیت دینا شروع
کر دی، کیونکہ وہ اس کے ذریعے اپنا کام نکال
سکتے تھے۔ انھیں بڑی بڑی سائنسی میٹنگوں میں دعوت
دی جاتی، وہ بھی بطور مہمانِ خصوصی کے۔ اب
آپ لوگوں کے ذہنوں میں سوال اُبھرے گا کہ
ہر وقت تو خفیہ نگرانی کرنے والوں کی نظریں ہر
شخص پر جمی رہتی ہیں اور ایسے اجلاسوں میں تو
خاص طور پر نگرانی کی جاتی ہے، پھر بھلا بیگم پاکیزہ
کس طرح جاسوسی کرتی رہی ہوں گی۔ تو اس کا
جواب یہ ہے کہ انشارجہ کی ایک حیرت انگیز ایجاد
نے ان کا یہ مسئلہ حل کر دیا۔ بھری محفل میں
بلا روک ٹوک جاسوسی کرنے کی انھیں آسانی ہو گئی،
انشارجہ سے آنے والے سائنس دانوں میں سے کوئی
ایک مثلاً پروفیسر کوٹان جان وہاں سے ہدایات لے
کر آتا رہا ہے۔ اور یہاں اپنے ایجنٹوں کو دیتا رہا
ہے۔ سب کی موجودگی میں رہتا اور اطلاعات وصول
کرتا رہا ہے اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہو

باقی — ٹھہریے ، میں اس کا عملی تجربہ کرا دیتا ہوں ، بیگم پاکیزہ کی جیب میں اس وقت بھی یہ سیاہ رنگ کا آلہ موجود ہوگا — آپ ذرا یہ آلہ دیں گی ۔"

"میرے پاس نہیں ہے ۔" اس نے جل کر کہا ۔

"دے دیں بھئی — ورنہ پھر تلاشی لی جائے گی ۔"

"ضرور لیں تلاشی ۔"

"فرزانہ ! ان کی تلاشی لو اور سیاہ آلہ نکال لو ۔"

"جی بہتر !" فرزانہ نے کہا اور اٹھ کر بیگم پاکیزہ کی تلاشی لینے لگی ، لیکن اس کے کپڑوں میں سے وہ آلہ برآمد نہ ہوا :

"نہیں ہے ابا جان ۔"

"بھئی تم نے غور سے تلاشی نہیں لی ۔"

"تو آپ نے کب فرمایا تھا کہ تلاشی غور سے لینی ہے ۔" فرزانہ نے کہا اور اس کے بالوں میں انگلیاں داخل کر دیں ۔

"یہ کیا کر رہی ہو ؟"

"فکر نہ کرو — جوئیں تلاش نہیں کر رہی ۔" فرزانہ نے کہا اور پھر اس کے ہاتھ میں ویسا ہی سیاہ آلہ نظر آیا —

"بہت خوب ! یہ ہوئی نا بات — اب ذرا یہ آلہ تم اپنے ہاتھوں سے ہی صدر صاحب کے کالر میں لگا دو — دوسرا میں اپنے کالر میں لگا رہا ہوں ۔"

"جی بہتر !"

"لیکن اس سے کیا ہوگا بھئی — میں ہاتھ میں پکڑ لیتا ہوں ۔" صدر صاحب بولے ۔

"نہیں سر — کالر میں لگانا ضروری ہے ۔"

فرزانہ نے ان کے کالر میں آلہ لگا دیا ، دوسرا انسپکٹر جمشید نے لگا لیا —

"اب دیکھیے — اس کمرے میں بات چیت ہو رہی ہے ، آپ سب لوگ ذرا ایک دوسرے سے باتیں کرنا شروع کر دیں — میں ایک پیغام اس آلے کے ذریعے صدر صاحب کو دوں گا ، پھر آپ سے بات کروں گا ۔"

سب ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے — ایسے میں اچانک صدر صاحب کے چہرے پر حیرت پھیل گئی —

"بس حضرات — اب ذرا خاموش ہو جائیں ۔"

ان کی آواز سن کر سب خاموش ہو گئے —

"کیا آپ میں سے کوئی بتا سکتا ہے کہ میں نے صدر صاحب سے کیا بات کی ہے ؟"

"جی نہیں — آپ نے تو ان سے کوئی بات نہیں کی ۔" ایک صاحب بولے —

"میں نے ان سے بات کی ہے — انھیں ایک پیغام دیا ہے ۔"

"کیا واقعی - لیکن کیسے؟" کئی آوازیں اُبھریں۔

"پہلے صدر صاحب سے پوچھیں، میں نے انھیں کیا پیغام دیا ہے۔"

"جمشید تم نے مجھ سے کہا ہے کہ اس کیس کے مجرموں کو اگر رہا کیا گیا تو یہ مُلک کے حق میں زہر ہوگا۔"

"لیکن یہ الفاظ انھوں نے ادا ہی نہیں کیے تو آپ نے سُن کیسے لیے؟"

"اس آلے کی مدد سے۔"

"کیا آپ نے آلے کے پاس منہ کر کے یہ جملہ کہا تھا؟" وزیرِ اعظم نے انسپکٹر جمشید سے پوچھا۔

"کیا آپ میں سے کسی نے مجھے ایسا کرتے دیکھا ہے؟" انسپکٹر جمشید نے سب سے پوچھا۔

سب نے نفی میں سر ہلا دیے۔

"اچھا! اب آپ آلے کے قریب منہ لے جا کر دبی آواز میں کوئی بات کہیں۔ جو میں آواز سے نہ سُن سکوں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

صدر صاحب نے ایسا ہی کیا۔ انسپکٹر جمشید مسکرائے اور بولے:

"جی نہیں۔ مجھے کچھ پتا نہیں چلا۔ اب میری طرف دیکھیے، میں ہونٹ نہیں ہلاؤں گا۔ اس کے باوجود آپ میری بات سُن سکیں گے۔"

سب نے ان پر نظریں جما دیں۔ انھوں نے نہ تو منہ

آلے کے نزدیک کیا، نہ ہونٹ ہلائے۔ آدھ منٹ بعد انھوں نے پوچھا:

"میں نے کیا کہا ہے؟"

"تم نے جمشید کہا ہے کہ اگر تم چاہو تو یہ الفاظ اس آلے میں ریکارڈ بھی ہو سکتے ہیں۔ مطلب یہ کہ یہ آلہ صرف سُنتا اور سُناتا ہی نہیں۔ الفاظ کو ریکارڈ بھی کرتا ہے۔"

"لیکن کون سے الفاظ۔ آپ نے تو ہونٹ ہلائے ہی نہیں۔"

"ہاں! ہم دماغ میں جو کچھ سوچیں گے۔ یا دماغ کے ذریعے جو پیغام دینا چاہیں گے، وہ پیغام یہ آلہ دوسرے آلے تک پہنچائے گا۔ اور دوسرا آلہ جس کے کالر میں لگا ہو گا، وہ اپنے دماغ کی لہروں کے ذریعے بات سمجھ لے گا۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

چہروں پر حیرت ہی حیرت نظر آنے لگی۔

دھمکی

"یہ تحقیق پروفیسر داؤد صاحب کی ہے، لیکن یا بھی بات اور آگے تک ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وہ تمام گفتگو جو آپس میں اس آلے کے ذریعے کی جائے گی، وہ یہ آلہ ریکارڈ بھی کرے گا۔ اپنے مُلک میں جا کر یہ لوگ سب مل کر ساری معلومات کو سنتے ہیں، اس کے بعد ہمارے مُلک کے خلاف سازشیں تیار کی جاتی ہیں۔ یعنی ان معلومات کو بنیاد بنا کر سازشیں ہوتی ہیں، منصوبے تیار کیے جاتے ہیں اور پھر ان منصوبوں پر عمل کرانے کے لیے سی مون جیسوں کو بھیجا جاتا ہے۔"

"اُف مالک۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ خود انشارجہ کی حکومت ہمارے مُلک کی جاسوسی اس قدر بڑے پیمانے پر کراتی ہے۔ اور انشارجہ بنتا ہے ہمارا دوست۔"

"یہ۔ یہ تو بہت زیادہ خوفناک بات ہے۔ اس کا مطلب

تو پھر یہ ہے کہ ہمارے مُلک کا کوئی راز بھی انشارجہ کے لیے راز نہیں رہتا۔" صدر صاحب نے پریشان ہو کر کہا۔

"جی ہاں! یہی سب کچھ ثابت کرنے کے لیے میں نے آپ سب کو یہاں جمع کیا ہے۔ اب آپ مجھے جو سزا دینا چاہیں، دے سکتے ہیں اور میں ہر سزا جھیلنے کے لیے تیار ہوں۔"

"سزا اور تمہیں۔ یہ تم کیا کر رہے ہو جمشید۔ تم تو ہمارے مُلک کے ہیرو ہو۔ میں مسٹر رابرٹ کو اپنے ملک کے خلاف جاسوسی کے الزام میں گرفتار کرنے کا حکم دیتا ہوں اور ان کے باقی ساتھیوں کو بھی۔ بیگم پاکیزہ کو بھی اور ڈاکٹر رضا خان کو بھی۔"

"آپ کیا کر رہے ہیں مسٹر صدر۔ کیا آپ جانتے نہیں۔ آپ کا پورا ملک ہمارے ملک کا مقروض ہے۔ آپ کے ملک کا ہر شہری ہمارے ملک کا لاکھوں روپے کا مقروض ہے۔ اور پھر ہمیں گرفتار کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ ہماری حکومت شارجستان کو فوراً حکم دے گی کہ وہ آپ کے مُلک پر حملہ کر دے، فوجیں، ہم نے پہلے ہی جمع کروا رکھی ہیں، کیونکہ ہم جانتے تھے، ایسا وقت آ سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کر سکتے ہیں کہ ہمیں ناپسندیدہ افراد کہ کر ہمارے مُلک بھیج سکتے ہیں اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس صورت میں آپ ایک مہلک جنگ

ے بچ جائیں گے۔ اب فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے۔"

"جمشید! تم مشورہ دو۔"

"سر! یہ لوگ اسی لیے تو بے خوف ہو کر جاسوسی کرتے ہیں کہ کسی وقت ان کا جرم سامنے آ بھی گیا تو بھی ان کا کچھ نہیں بگڑے گا، زیادہ سے زیادہ انھیں ناپسندیدہ افراد قرار دے کر واپس بھیج دیا جائے گا۔ لہٰذا میں تو یہی کہوں گا۔ ان لوگوں نے ہمارے ملک کو اس قدر نقصان پہنچایا ہے کہ ہم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ اس لیے انھیں گرفتار ہی کیا جائے۔"

"بہت خوب! تم نے میرے دل کی بات کہی۔ انھیں گرفتار کر لیا جائے۔"

"تو پھر پورا ملک ایک خوفناک جنگ کی لپیٹ میں آ کر رہے گا۔" رابرٹ نے دھمکی دی۔

"کوئی پروا نہیں۔ اور جہاں تک بات ہے قرض کی۔ تو یہ سب سود کا بوجھ ہے۔ ہم سود ادا نہیں کریں گے۔ تمھاری حکومت جو چاہے کر لے۔" صدر صاحب بولے۔

"دیکھ لیا جائے گا۔" اس نے غرا کر کہا۔

انھیں گرفتار کر لیا گیا اور وہ سب لوگ سکتے کے عالم میں وہاں سے رخصت ہوئے۔ ہر ایک کے ذہن میں تھا

کہ نہ جانے اب کیا ہو گا۔ صدر صاحب نے کمانڈر انچیف کو ساری صورتِ حال بتا دی اور انھیں پوری طرح تیار رہنے کی ہدایات دیں۔ ادھر انشارجہ کے صدر کا فون صدر صاحب کو ملا۔ انھوں نے فون پر خوب دھمکیاں دیں کہ اگر رابرٹ اور اس کے ساتھیوں کو نہ چھوڑا گیا تو یہ ہو جائے گا، وہ ہو جائے گا۔ یورپ کے تمام ملک مل کر آپ کے ملک پر حملہ کر دیں گے۔ لیکن صدر صاحب جمشید کے سکھائے ہوئے تھے۔ ٹس سے مس نہ ہوئے اور اپنے فیصلے پر ڈٹے رہے۔ اس کش مکش میں دس دن گزر گئے۔ اور شارجستان نے ان کے ملک پر حملہ نہ کیا۔ دس دن بعد انسپکٹر جمشید وغیرہ جیل میں رابرٹ اور اس کے ساتھیوں سے ملنے گئے۔

"مسٹر رابرٹ ابھی تک شارجستان نے حملہ نہیں کیا۔ ہمارے ملک کی اینٹ سے اینٹ نہیں بجائی گئی۔ آخر کیوں؟"

رابرٹ کے پاس ان کی بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ ان سب کے چہروں پر مایوسی کا دور دورہ تھا۔ چہرے لٹکے ہوئے تھے۔

"مسلمان اگر اپنی قوتِ ایمانی سے کام لینے پر اتر آئے تو پھر بڑی سے بڑی دنیاوی طاقت اس سے خوف کھانے لگتی ہے اور اگر مسلمان اللہ سے ڈرنا چھوڑ دے تو پھر ساری

دُنیا سے وُہ ڈرنے لگتا ہے اور ساری دُنیا اسے ڈرانے لگتی ہے ۔ مسٹر رابرٹ ۔ تم لوگوں کو بہت جلد پھانسی کی سزا دی جانے والی ہے ۔ اور تمہارا ملک ٹس سے مس نہیں ہو گا۔"

جب وُہ وہاں سے واپس مڑ رہے تھے ۔ تو بھی رابرٹ اور اس کے ساتھی اسی طرح سلاخوں سے لگے سر جھکائے کھڑے تھے ۔ یوں لگتا تھا ، جیسے ان کے جسموں میں اب کبھی حرکت نہیں ہو گی ۔

فائدے کی بات

- اس ماہ آپ نے "سرپھرا کیس" ، "چکر کی موت" ، "دشمن شہر" اور "چور راستا" پڑھے ۔
- آئندہ ماہ آپ اشتیاق احمد کا ستائیسواں خاص نمبر "یوڈا پر حملہ" پڑھیں گے ۔
- "یوڈا پر حملہ" کی قیمت ۴۸/۰۰ روپے ہے ۔
- ادارے سے براہِ راست منگوانے پر ہم آپ سے صرف ۴۳/۰۰ روپے وصول کریں گے ، اس طرح آپ ۵/۰۰ روپے بچا سکتے ہیں اور خاص نمبر آپ کو گھر بیٹھے مل جائے گا ۔
- آپ صرف ایک خط لکھ کر آرڈر دے دیں ۔ ہم بذریعہ وی پی خاص نمبر آپ کو ارسال کریں گے ۔ پوسٹ مین آپ سے رعایتی قیمت وصول کر لے گا اور خاص نمبر آپ کو دے دے گا ۔
- آپ صرف خط لکھ کر آرڈر دیں ۔ منی آرڈر یا ڈاک ٹکٹ ارسال نہ کریں ۔

آرڈر بھیجنے کا پتا :

اشتیاق پبلی کیشنز ، ۹/۱۲ نصیر آباد ، مسلم پورہ ، سانده کلاں ، لاہور